يَا قَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ

سَبِيلُ الرَّشَادِ

یعنی

تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کا وہ حصہ جس میں

سورۂ حجرات کی معنی خیز تفسیر ہے

از

خواجہ محمد عبدالحی فاروقی

اُستاذ تفسیر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علیگڑھ

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

سورۃ الحجرات

باب

خلیفۂ اُمّت کے آداب

فصل اوّل

مضمون	صفحہ

فصل ثانی

انسداد شر

صفحہ	مضمون

مطبع فیض عام علی گڑھ

طابع منشی عبد الکبیر (پبلشر خواجہ محمد عبد الحی صاحب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

تمہید

دنیا میں جس قدر مذاہب وادیان ہیں، اگر ان کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت صاف طور پر ذہن میں آجاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا روئے سخن اپنی اپنی قوم کی طرف تھا: وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر (۳۵ : ۲۳) اور کوئی اُمت نہیں مگر اس میں ہدایت کرنے والا گذر چکا ہے اور لکل قوم ہاد، ہر ایک قوم میں ہادی اور راہ نما بھیجے گئے ہیں، اور ازمنہ ماضیہ کے واقعات اور جغرافیائی حالات بھی اسی کے مقتضی تھے، اس لئے کہ ان ایام میں بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، ہر ایک قوم اپنے اپنے ملک میں آباد تھی، اور بعض تو اپنے حدود ملک سے باہر جانا خلاف مذہب و دیانت خیال کرتے تھے، چنانچہ پرانے خیال کے ہندوؤں میں اب تک یہ عقیدہ راسخ ہے، اور وہ اس شخص کو برادری سے خارج خیال کرتے ہیں جو سمندر پار چلا جائے، غرض یہی حال دوسرے مذاہب کا بھی ہے۔

جب دنیا نے زیادہ ترقی کی، ایک ملک کے رہنے والے غیر ممالک میں آنے جانے لگے، باہمی روابط قائم ہو گئے اور اب تک جو اجنبیت قائم تھی وہ رفع ہو گئی، تو اب تمام کرۂ ارضی کے لئے ایک ہی رسول مبعوث کیا گیا: وما ارسلنٰك الا رحمة اللعٰلمین، جس کا روئے سخن جملہ اقوام عالم کی طرف ہی: وما ارسلنٰك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا، (۳۴ : ۲۷) اور اے محمد! ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہی، اور رقل یاایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا، (۷ : ۱۵۷) اے محمد کہدو کہ لوگو میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا یعنی اس کا رسول ہوں، اور تبارك الذی نزل الفرقان علیٰ عبده لیکون للعلمین نذیرا، (۲۵ : ۱) وہ خدائے عزوجل بہت ہی بابرکت ہی جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ اہل عالم کو ہدایت کرے۔ سب اسی ایک حقیقت کو واضح کرتی ہیں، اور آپ کی امت کو خیر امتٍ اخرجت للناس کے معزز ترین خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

طرقِ اشاعت

اس عالم کون و فساد میں ادیان و مذاہب، اصول و عقائد اور خیالات و افکار کی نشر و اشاعت کے مختلف طریقے رہے ہیں:

(۱) دنیا سے اجتناب کلی اختیار کر لیا جائے، مال و متاع، جاہ و منزلت، اور ارحام و اولاد سے کوئی تعلق نہ رہے، ہر ایک لمحہ حیات زہد و رہبانیت میں گزرے، اور ایسے ورع و تقویٰ نیکی و فرشتگی، اور طہارت و پاکیزگی کے ذریعہ سے اپنے خیالات کی تبلیغ و توزیع کی جائے، اور دوسروں کو بھی اسی زندگی کی جانب دعوت

دی جائے، حضرت زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اسی صنف میں داخل تھے۔

(۲) حکومت کی اعانت حاصل ہو، اور اس کی تائید سے اپنے اصول و عقائد کی اشاعت ہو، بنی اسرائیل کے مذہب کا شیوع اسی کا رہین منت تھا، اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان لوگوں کو حکومت نہ مل سکی، مگر انہوں نے بنیاد ایسی ڈالدی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ارض شام میں یہودیوں کی زبردست حکومت قائم ہوگئی، داؤد و سلیمان اسی گروہ میں شامل تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ان لوگوں کی حکومت اطراف عرب میں موجود تھی۔

اور سچ پوچھئے تو عیسائیت کا اصلی دور بھی اسی وقت شروع ہوا ہے جب اس نے آغوش حکومت میں پرورش پانا شروع کی، اور لوگوں کو تلوار کے زور سے عیسائی بنانا شروع کیا، ورنہ اس سے قبل تو ہر جگہہ یہ لوگ دربدر مارے پھرتے تھے قسطنطین ہی کی بدولت اس میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے، اس نے ۳۱۳ع میں تخت پر بیٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ سلطنت کا مذہب عیسائی ہے، پھر جب قیصر تھودو میں ۳۷۸ع میں سلطنت کا مالک ہوا تو اس نے ۳۸۱ع میں حکم نافذ کر دیا کہ رعایا کے ایک ایک فرد کو جبر و اکراہ سے عیسائی بنالیا جاوے۔ اشوکا کی سرپرستی نے بدھ مذہب کو ہندوستان کے اطراف و اکناف میں پھیلا دیا، اور مجوسیت اپنے نشو و ارتقا کے لئے سائرس کی رہین منت ہوئی۔

(۳) کتابوں کے ذریعہ سے عوام الناس تک اپنے خیالات پہونچا دیے جائیں اور مصنفات و تالیفات کا سلسلہ قائم کر دیا جائے، تاکہ ان کے یقینیات کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ ہوتی رہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک ہی طریق تنہا کامیابی کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا، دائمی فلاح و کامرانی اسی کو نصیب ہوگی جو تمام طرق تبلیغ پر حاوی ہو، اور ہر ایک طرح اپنے خیالات کی اشاعت میں مصروف ہو، یورپ کو دیکھئے، اس نے ایک طرف مبشرین مسیحیت کو ایشیائی ممالک میں بھیجدیا ہے، جو اپنے مصنوعی ورع و تقویٰ اور نمائشی طہارت و پاکیزگی سے لوگوں کو اپنے دام تزویر میں مبتلا کرتے ہیں، ان کی تائید و حمایت میں تمام عیسائی دول جنگی مظاہرے شروع کر دیتی ہیں، ساتھ ہی اس کے کتابیں تالیف ہونا شروع ہو جاتی ہیں، جن میں ان مبلغین کی مظلومیت و بے بسی، اور ایشیائی اقوام کی وحشت و بربریت، عصیان و تمرد، اور جہالت و لاعلمی کی مفروضہ داستانیں لکھی جاتی ہیں، اخبارات میں سلسلہ مضامین شروع ہو جاتا ہے، اور جدید ترین آلات خبر رسانی کے ذریعہ آن واحد میں تمام دنیا کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ بنا لیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد جوع الارض کے عفریت کو خوش کرنے کے لئے جو نتائج نکلتے ہیں، قلم میں طاقت نہیں کہ ان کو تحریر میں لا سکے۔

اُمّۃً وسطاً

مگر در اصل طرز تبلیغ ان نقائص سے ارفع و اعلیٰ ہونا چاہئے، اگر مبلغین و دعاۃ کے ایک ہاتھ میں تلوار ہو، تو دوسری طرف ان کے سر پر ورع و پاکیزگی کا تاج بھی ہو، جب ان کو مخالفین سے لڑنا پڑے تو ہنگامی جواب دینے کے بعد انہیں اپنی آغوش محبت میں بھی لینے کو تیار ہوں، جس وقت وہ شرارت سے باز آجانے کا اقرار کر لیں، اور ان سے عفو و درگزر بھی کر سکیں،

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعائے خلیل اور نوید مسیحا فرزند آمنہ کو مبعوث کیا جس کی

ذات قدسی تمام انبیاے کرام و رسل عظام کے خصائص و امتیازات کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے تھی، جنہوں نے ایک طرف تو بدر اور خیبر کے معرکوں میں تلوار چلائی، تو دوسری جانب فتح مکہ کے روز ان تمام مشرکین کو انتم الطلقاء فرما کر عفو عام دیدیا جو کل تک آپ کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے، جو ادھر تو ساری ساری رات

فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بك علی ھؤلاء شھیدا (۴ : ۴۰)

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والوں کو بلائیں گے، اور تم کو ان لوگوں کا گواہ طلب کرینگے۔ کی تلاوت اور درس و مطالعہ میں مصروف رہتے ادھر احد اور حنین میں فوج کے پیش پیش بھی آپ ہی ہوتے۔

یہی وہ رسول تھا جس نے جملہ مذاہب و ادیان کے اتباع کو اپنے جھنڈے تلے آنے اور آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کی دعوت دی، اس لئے کہ وہ تمام رہ نمایان ملل کا نمونہ، صفات حسنہ کا جامع، اور کامل انسانیت کا پیکر مجسم تھا، یہی وجہ ہی کہ اس کی امت کو اُمۃً وّسطاً کا لقب دیا گیا، اور اس کو شہداء علی الناس کے درجۂ علیا پر فائز کیا گیا: وکذٰلك جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا، (۲ : ۱۴۲) اور اس طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا ہی تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو، اور پیغمبر آخر الزماں تم پر گواہ بنیں جس میں افراط ہی نہ تفریط، جس نے عبداللہ کو ابن اللہ نہیں بنایا، بلکہ اس کی فضیلت و برتری اسی عبداللہی ہونے میں محصور کر دی، اور جس نے کفارہ کے غلط اور دور از عقل عقیدے کی جگہہ ہر شخص کو ایک ذمہ دار اور مسؤل انسان قرار دیا۔

شہداء علی الناس

تمام مذاہب میں تحریف ہوچکی تھی، جملہ صحائف واسفار آسمانی میں تبدیلیاں کردی گئی تھیں، خود انبیائے کرام کی طرف مہمل روایات اور دور از کار افسانے منسوب کئے جاتے تھے، حضرت سلیمان کے واقعات، قصص یہود و روایات طالمود میں بیحد مسخ ہوگئے تھے، یہودیوں کے یہاں حضرت سلیمان کی وہی حیثیت ہوگئی تھی جیسی عوام مسلمانان ہند میں امیر حمزہ نامی ایک فرضی ہیرو کی، صدہا مزخرفات وما فوق الفطرۃ عجائب وغرائب ان کی طرف منسوب ہوگئے تھے، اور گھر گھر پھیل گئے تھے، اسلام نے آتے ہی وما کفر سلیمٰن ولکن الشیطین کفروا (۲ : ۱۰۱) اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی، بلکہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے۔ کہکر انبیائے عظام کے دامن کو آلودگی عصیان سے پاک دکھایا، امہ صدیقۃ کہکر مریم بتول کی طہارت کا اعلان کیا، اور لن یستنکف المسیح ان یکون عبداً اللہ ولا الملئکۃ المقربون (۴ : ۱۷۱) مسیح علیہ السلام کے عبد اللہ ہونے کو بیان کیا، احبار، رہبان، اور براہمہ ہی صرف کتب الٰہیہ کے درس ومطالعہ سے بہرہ اندوز ہوسکتے تھے، اور صرف انہیں لوگوں کے پروانہ ہائے راہ داری لوگوں کو دوزخ کی آگ سے نجات دلا سکتے تھے، قرآن نے ان تمام مزعومات کی قلعی کھولدی، اور یایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر وانثیٰ وجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ط (۴۹ : ۱۳) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہی جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ کہکر بتادیا کہ اللہ کی نظر میں سب ایک ہیں، اور عزت

صرف اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہی جو تقویٰ اور طہارت سے آراستہ ہو، غرض قرآن کے نزول کا مقصد ہی یہی تھا: لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور، تاکہ تم لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں لے جاؤ۔ اور تضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم (۷: ۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے اتارتے ہیں

ان تمام اقوام وملل کی اصلاح وتہذیب کا مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیا گیا، اور انہیں سب کا نگراں کار بنا دیا گیا کہ خود نمونہ بن کر ایک ایک انسان کے اخلاق واعمال کی حفظ وصیانت کریں، اور اسے فسق وفجور سے بچائیں: وکذٰلک جعلنٰکم امة وسطاً لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیداً، اسی ذمہ داری کو حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا: من رای منکم منکرا فلیغیره بیده، فان لم یستطع فبلسانه وان لم یستطع فبقلبه، وذالک اضعف الایمان، تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنی قوت سے مٹا دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اس کی برائی بیان کرنے سے دریغ نہ کرے، اور اگر اس کی بھی قوت نہ ہو تو دل سے ضرور نفرت رکھے، اور یہ ایمان کی ضعیف ترین حالت ہی۔ اسی لئے ان کو خیر امت اخرجت للناس کے لقب سے سرفراز کیا گیا، تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر، ان کا طغرائے امتیاز ہے، اور یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً ان کا وصف خصوصی، مگر کوئی جماعت اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتی جب تک کہ طہارت وپاکیزگی، اور ورع وتقویٰ کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ میں قوت وطاقت نہ دی جائے، اس لئے کہ خدا کی اسی زمین پر بعض لوگ ایسے بھی بستے ہیں جو صرف قوت کے آگے گردن جھکا سکتے ہیں، اسلئے قرآن نے ببانگ دہل اس حقیقت کا چار

دانگ عالم میں اعلان کردیا: وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم، (۲۴: ۵۵) جو لوگ تم میں سے ایمان لائے، اور نیک کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنائیگا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ کہ خلافت ارضی کے حقیقی وارث صرف فرزندان اسلام ہی ہیں، اور یہی اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ دنیا کے کسی گوشہ میں شرک وبت پرستی نہ ہونے دیں، اور ہر جگہ صرف ایک اللہ کی پرستش ہو۔

اولی الامر کی اطاعت

غرض قرآن کریم کا قانون دنیا میں رائج کرنے کے لئے جو حکومت اپنے تئیں وقف کردے، وہ مسلمانوں کے لئے اولوالامر کا درجہ رکھتی ہے جس کی اطاعت سے کوئی مسلمان من حیث القوم سرتابی نہیں کرسکتا، اس لئے کتاب وسنت نے کثرت سے اس کی اطاعت وفرمانبرداری پر زور دیا: یایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم، سورۂ نساء میں آتا ہے: ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منہم لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم ط (۴: ۸۳) اور اگر اس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہونچاتے، تو تحقیق کرنے والے اسکی تحقیق کرلیتے۔ مسند امام احمد میں ہے: انا امرکم بخمس، اللہ امرنی بھن، الجماعۃ، والسمع والطاعۃ، والھجرۃ، والجھاد فی سبیل اللہ، ومن خرج من الجماعۃ قید لشبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ، الا ان یراجع، ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من جثی جھنم، قالوا یا رسول اللہ وان صام وصلی، قال و ان صام وصلی وزعم انہ مسلم، فادعوا المسلمین باسمائھم علی ما سماھم

اللہ المسلمین المومنین عباد اللہ، میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں، اتباع جماعت، امیر کی اطاعت و فرمانبرداری، ہجرت، جہاد فی سبیل اللہ، جو شخص ایک بالشت بھر بھی جماعت سے الگ ہوا تو اس نے گویا حلقہ اسلام کو اپنی گردن سے نکال دیا، اور جس شخص نے دعا دی جاہلیت کی طرف بلایا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا، لوگوں نے عرض کیا، اگرچہ وہ نماز و روزہ کا پابند ہو، فرمایا ہاں، تم مسلمانوں کو اس نام سے پکارا کرو جو خدا نے ان کا نام رکھ دیا ہے، تمام ارباب ایمان اللہ کے بندے ہیں۔ بخاری میں ہے: من اطاعنی فقد اطاع اللہ، ومن اطاع امیری فقد اطاعنی، ومن عصی امیری فقد عصانی، جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور میرے امیر کی اطاعت میری فرمانبرداری ہے، اور میرے امیر کی نافرمانی دراصل میری نافرمانی۔ ایک روایت میں اس طرح آتا ہے: من خلع یدا من طاعۃ لقی اللہ یوم القیمۃ ولا حجۃ لہ، ومن مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ جس نے اپنے امیر کی نافرمانی کی تو قیامت کے روز وہ اللہ کے دربار میں کوئی عذر نہ پیش کر سکیگا، اور جو شخص بیعت کئے بغیر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مریگا۔

اس قسم کی روایات اور بھی جمع کی جاسکتی ہیں، جو اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے، کیونکہ جب تک اس کی اطاعت نہ کی جائیگی، کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

انتخاب امیر

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس امیر اور خلیفہ کے انتخاب کی کیا صورت ہوگی، قرآن حکیم نے اصول کے طور پر ہمیں ایک چیز بتائی ہے، اور وہ یہ ہے: وامرھم شوریٰ

بینہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتخاب امیر کے فریضہ کو خود امت کے ہاتھوں میں دیدیا کہ وہ جس کو اہل خیال کرے، اسکے ہاتھ میں اپنی باگ دیدے، اس طرز عمل سے آپ نے دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ خلیفہ اور امام کے معین کرنے میں امت کو کامل اختیار دیدینا چاہیئے تاکہ وہ خود اپنی حریت فکر و اجتہاد رائے سے کام لیکر دیکھ لے کہ اس کی راہ نمائی کی سب سے زیادہ اہلیت کس شخص میں ہے، ادھر آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ حکومت اور خلافت کسی خاص خاندان کا موروثی ترکہ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مہاجرین و انصار سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہوئے، اور تھوڑی سی بحث و مشاورہ کے بعد ارباب حل و عقد نے اپنے میں سے بہترین انسان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا، جب خلیفہ اوّل کی وفات کا زمانہ قریب آیا تو آپ نے ذمہ دار ارکان جمہوریت سے فرداً فرداً رائے لیکر، اور سب کو متفق پاکر حضرت عمر کو اپنا جانشین نامزد کر دیا، جن کے ہاتھ پر تمام اُمت نے بیعت کر لی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کی ایک مجلس مقرر کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اپنے میں سے ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں، اور پھر اسی کے ہاتھ پر بیعت عامہ ہو، چنانچہ حضرت عثمان کا انتخاب عمل میں آیا، اور سب نے ان کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا، ان کے مقتول ہونے پر فتنہ و فساد کا باب کھل گیا، مگر مدینہ منورہ میں اس وقت جس قدر ارباب حل و عقد جمع تھے، اُنہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا امیر چن لیا۔

تم ان طرق انتخاب کو پڑھو، اور بار بار پڑھو، تم دیکھو گے کہ اس میں نسل، خاندان،

وغیرہ کسی چیز کو دخل نہیں، اگر یہ چیز اسلام کے پیش نظر ہوتی تو سب سے پہلے رسول اللہ اس خلافت کو صرف بنو ہاشم میں منحصر کر دیتے، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس اختیار کو اُمت کے تفویض کر دیا، ابو بکر نے بھی اسی اسوۂ حسنہ پر عمل کیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اس کو اور زیادہ واضح کر دیا، آپ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ کو اس کمیٹی کا ایک رکن بنایا جو آپ کی وفات کے بعد انتخاب خلیفہ کے مسئلہ پر غور کرنے والی تھی، تاکہ اس مسئلہ میں ان کی اصابت رائے سے فائدہ اٹھایا جا سکے، مگر ساتھ ہی اس کے یہ شرط بھی لگا دی کہ اگر بالفرض کمیٹی کی کثرت رائے بھی اس کو خلیفہ انتخاب کرلے تو بھی وہ خلیفہ نہیں بن سکتا۔

اسلام کا حقیقی طریق حکومت یہی تھا، جو ہمیں خلفائے راشدین کے زمانہ میں دکھائی دیتا ہے؛ علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین، اور انہیں بزرگان ملت کا منہاج عمل ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

شرائط امامت

اس باب میں قرآن مجید نے بالکل صاف صاف اور کھلے کھلے احکام صادر فرمائے ہیں، حکومت اور امت کا نظم و ادارہ در اصل ایک عظیم الشان امانت ہے جو کسی کے سپرد کی جا سکتی ہے، اسلئے اس نے بغیر رنگت اور نسل کی تخصیص کے یہ بتا دیا کہ: ان تودوا الامانت الی اهلها، ہر ایک امانت اس کے اہل کو دی جائے، اور اسی لئے حدیث میں امارات قیامت میں سے آپ نے یہ علامت بھی بتائی: اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة، جب ایک کام کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیا جائیگا جو اسکے کرنے کا اہل نہ ہوگا تو اس کام کے خاتمہ اور قیامت کا انتظار کرو۔ اس لئے کہ جب

ایک شخص کسی کام کا اہل نہیں ہوگا، تو وہ اسے خراب و برباد کرنے کے سوا اور کیا کریگا۔

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کا قصہ تم نے بارہا پڑھا ہوگا، انہیں ایک بادشاہ کی ضرورت ہی، اور ان کا خیال یہ ہی کہ صرف ارباب دولت و ثروت ہی حکومت کے حق دار ہیں، مگر قدرت کی نظر انتخاب اس شخص پر پڑتی ہی جو اس اعتبار سے بالکل تہیدست اور مفلس ہی، اور قوم کا اس کی نسبت یہ فیصلہ ہی: ولم یؤت سعة من المال اور اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں، مگر ناموس الٰہی نے انہیں جواب دیا: ان اللہ اصطفٰه علیکم وزادہ بسطة فی العلم والجسم، (۲: ۲۴۷) حکومت کے لئے بہترین علم سیاست و جہانداری کی ضرورت ہی، داخلی و خارجی تنظیم و اصلاح سے واقفیت ہو، بین الاقوامی تعلقات، فلسفۂ عروج وزوال، اور ارتقاے قومی کی تمام راہیں معلوم ہوں، ہر ایک مسئلہ میں بصیرت ناقدہ اور اجتہاد و فکر سے کام لینے کی قابلیت ہو، فنون حرب کی مہارت تامہ اور دسائس جنگ کا علم بھی الزم اللوازم ہی، اور بزدلی و نامردی سے بھی دور ہو، اور یہ اوصاف و کمالات صرف طالوت ہی میں پائے جاتے ہیں۔

سورۂ مجادلہ میں آتا ہے: یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت، (۵۸: ۱۱) جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں، اور جن کو علم عطا کیا گیا ہی خدا ان کے درجے بلند کریگا، اس سے یہ مقصود ہی کہ مسلمانوں میں سے قدر و منزلت کا اعلیٰ ترین مرتبہ خلافت اس شخص کو دیا جائے، جس نے دنیائے اسلام میں سب سے زیادہ ایثار و قربانی سے کام لیا ہو، اور جو تمام علوم سیاست و دیانت پر حاوی ہو، سورۂ نساء میں ہی: واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ، ولو

ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منہم لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم، تو اس سے بھی یہی مراد ہی کہ خلیفہ اور امام وہی شخص بن سکتا ہی جو حریت عقل واجتہاد فکر سے کام لے سکے، جو استنباط نتائج وشواہد اور استخراج اصول وکلیات کی قابلیت رکھتا ہو، اور جسے سیاست اقوام میں درخور وافی حاصل ہو، سورۂ حجرات کی اس آیت نے ایک اور مزید شرط یہ لگا دی: ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ انتخاب صدر کی اعلیٰ ترین واولین شرط وخصوصیت تقویٰ ہی۔

ان تصریحات سے یہ معلوم ہوگیا کہ شریعت نے کسی خاندان کو خلافت کے لئے مخصوص نہیں کیا، یہی وجہ ہی کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان کیا: ان ادرکنی اجلی وابو عبیدۃ حی استخلفتہ وان ادرکنی اجلی وقد مات ابو عبیدۃ استخلفت معاذ بن جبل، اگر میری وفات کے وقت ابو عبیدہ زندہ ہوئے تو میں انہیں اپنا خلیفہ نامزد کرجاؤنگا، اور اگر وہ فوت ہو گئے تو معاذ بن جبل کو مقرر کرجاؤنگا۔ اور ایک دفعہ یہی بات آپ نے حضرت ابو حذیفہ کے غلام سالم کے لئے فرمائی تھی۔

حدیث شریف میں الائمۃ من قریش وارد ہوا ہی، جس کی بعید تاویل کی طرف گزشتہ چند سال میں بہت سے کارکنان خلافت مائل رہے، لیکن ہمارے نزدیک الائمۃ میں الف لام عہد ذہنی مان لیا جائے، اور دوسری حدیث کو اس کی طرف مشیر سمجھا جائے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ خلفا کی خبر دی ہی، اور جن کا برسراقتدار ہونا قیامت سے پہلے لازمی ہی، تو ساری دقت حل ہوجاتی ہی۔

مگر چونکہ اس ارشاد رسالت کا سیاق کلام عام ہی اسلئے تمام مسلمان مصنفین نے اہلیت

خلافت کی تمام شرائط میں ایک شرط قرشیت بھی تسلیم کی ہی، اور ظاہر ہی کہ یہ قریش کوئی ایک خاندان یا قوم نہیں، بلکہ ایک بہت بڑا قبیلہ ہی جس کی موجودہ مردم شماری اگر تلاش سے دیکھی جائے تو کئی کروڑ نفوس پر مشتمل ہوگی، پس جو اعتراض بعض نافہموں کو اس شرط کی وجہ سے پیش آتا ہی، وہ اس وقت وارد ہو سکتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم وغیرہ کی شرط لگاتے۔

مجلس شوریٰ

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا، اس سے ہر شخص بآسانی یہ اندازہ لگا سکتا ہی کہ قرآن حکیم نے کس قسم کی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی، جبکہ دنیا کے تمام اطراف میں صرف شخصی حکومتیں قائم تھیں، اسلام نے بالکل ایک جدید اور صحیح ترین شاہ راہ عمل پیش کی، ممکن ہی بعض لوگوں کو گمان ہو کہ اس انتخاب کے بعد خلیفہ بالکل خود مختار ہو جاتا ہو گا، لیکن دراصل اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن نے مسلمانوں کی امتیازی خصوصیت وامرھم شوریٰ بینہم بیان فرمائی ہی، اس لئے خلیفہ کو ایک مجلس شوریٰ منعقد کرنی پڑیگی، جو اس کو تمام مہمات امور ملکی میں مشورہ دیگی، حدیث میں آتا ہی: ماتشاور قوم قط الا ھدوا لارشد امورھم، جب کبھی ایک جماعت کسی کام کے لئے مشورہ کرتی ہی تو باہمی بحث ومشاورہ کی وجہ سے بہترین راہ اسکے سامنے آجاتی ہی۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ اگرچہ جنگ احد کے متعلق آپ کی رائے شہر کے اندر رہ کر لڑنے کی تھی، مگر کثرت رائے کے مطابق آپ نے باہر جاکر لڑنے کا فیصلہ کیا، اور تو اور واقعہ افک تک میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

بڑھکر میں نے کسی شخص کو مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

یہ تو اس ذات اقدس کا حال تھا جس کو انسانوں کے مشورہ کی ضرورت نہ تھی، مگر اس نے اپنے طرز عمل سے آنے والی نسلوں کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کر دیا کہ ایک انسان خواہ وہ روحانیت اور تعلق باللہ کے کیسے ہی بلند ترین مقام پر فائز ہو، وہ مشورہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، چنانچہ اب ان کو دیکھو جنہوں نے اس قدسی صفت انسان کی آغوش رحمت میں تربیت حاصل کی تھی، اور جو اس کی صحبت و ہم نشینی کی برکت سے دنیائے اسلام کے سردار بن گئے تھے، بنو سقیفہ کی بعیت کے دوسرے روز مسجد نبوی میں بعیت عامہ ہوئی، اور اسکے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرش خلافت کی طرف سے حسب ذیل خطبہ دیا:

"لوگو! خدا کی قسم، نہ مجھے اس امارت کی ضرورت تھی، اور نہ میں نے کبھی اس کی خواہش کی، اور نہ میں نے کبھی اسکے لئے دعا کی، لیکن میں ڈرا کہ کہیں فتنہ برپا نہ ہو جائے، اسلئے میں اس عظیم الشان بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا، ورنہ مجھے اس میں کوئی راحت نہیں، اور یہ ایک ایسا ناقابل برداشت بار ہے، جسکو اٹھانے کی میں اپنے میں طاقت نہیں پاتا، اور اللہ کی امداد کے بغیر اسکو تکمیل تک نہیں پہونچا سکتا، کیا اچھا ہوتا اگر کوئی دوسرا شخص میری جگہہ پر ہوتا، جو اس بوجھ کو اٹھا سکتا، گو تم نے مجھے اپنا امیر منتخب کر لیا ہے، مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر اچھا کام کروں تو میری امداد کرو، اور اگر غلطی کروں تو اصلاح کر دو، تم میں سے کمزور میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کا حق نہ دلوا دوں، اور تم میں سے قوی میرے نزدیک کمزور ہے جبتک اس سے حق نہ لے لوں، جبتک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کروں، تم میری

اطاعت کرو، اور ان کی نافرمانی کروں تو میرا ساتھ چھوڑ دو،،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تو بہت کثرت سے واقعات اس کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں، وہ ہمیشہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ جو خیر خواہی کی بات ہو مجھ تک پہنچا دو، اگر میں غلطی پر ہوں تو میری اصلاح کر دو، اور اگر راہ حق پر چل رہا ہوں تو میری اعانت کرو۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس اہلیت کا امتحان بھی لیا کرتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ دوران تقریر میں انہوں نے لوگوں سے سوال کیا کہ اگر میں غلطی کروں تو تم کیا کروگے، فوراً ایک بدوی نے تلوار کھینچ لی، اور کہا کہ اگر تم حق سے روگردانی کروگے تو ہم اس سے تمہیں سیدھا کر دینگے، آپ یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ الحمدللہ میری قوم میں اس قسم کے لوگ موجود ہیں کہ اگر میں غلط راہ اختیار کروں تو میری اصلاح کرنے کو تیار ہیں۔

آپ کے زمانہ میں جو مجلس شوریٰ تھی اس میں مہاجرین وانصار شریک ہوا کرتے تھے، تاریخ کی کتابوں میں ارکان مجلس میں سے حضرت عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، اور زید بن ثابت کے اسمائے گرامی خاص طور پر ذکر کئے گئے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں: کان من سیرۃ عمر انہ کان یشاور الصحابۃ ویناظرھم حتیٰ تنکشف الغمۃ ویاتیہ العلم، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ صحابہ کے ساتھ بحث ومشاورہ کیا کرتے، تاآنکہ حقیقت اصلیہ سامنے آجاتی، عراق اور شام کی فتح کے بعد بعض صحابہ کا اصرار تھا کہ تمام مفتوحہ مقامات کو فوج کی جاگیر میں تقسیم کر دینا چاہیئے، اس کو طے کرنے کے لئے تمام قدمائے صحابہ، مہاجرین وانصار، قبیلہ اوس کے پانچ نمائندے، اور خزرج

کے پانچ نمائندے مجلس مندوبین میں شریک ہوئے، پانچ روز تک اس کے مسلسل اجلاس ہوتے رہے، اور لوگوں نے پوری آزادی کے ساتھ تقریریں کیں۔

اس قدر تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام نے صرف شوریٰ کی حکومت قائم کی ہی، جو نہ صرف قانون ساز جماعت ہی بلکہ اُسکو عزل ونصب خلیفہ کا بھی پورا حق حاصل ہی۔

ارکان مجلس

جس طرح قرآن حکیم نے مجلس شوری کا انعقاد ضروری قرار دیا، اسی طرح اس نے یہ بھی بتادیا کہ کن لوگوں کو اس کا رکن بنایا جا سکتا ہی، اور وہ کون ہیں جنہیں اس کے لئے کھڑے ہونے کا موقع ہی نہ دینا چاہیئے، اگر آپ گزشتہ اوراق کو ایک مرتبہ دیکھ لیں جہاں ہم نے شرائط امامت کے عنوان کے ماتحت ان امور کو بیان کیا ہی جن کا ایک امام اور خلیفہ میں ہونا ضروری ہی تو اس سے معلوم ہو جائیگا کہ مجلس شوری کی رکنیت کے لئے بھی دراصل وہی شرائط ہیں جو امامت کے لئے ہیں، چوٹی کے لوگ منتخب ہوں، جو اپنے علم وفضل، ورع وتقویٰ، عقل وبصیرت، اور ایثار و قربانی کے اعتبار سے تمام مسلمانوں میں اعلیٰ ترین شمار کئے جاتے ہوں، جن کی تمام زندگی ملک وقوم کی خدمت میں بسر ہوئی ہو، اور جو کلیات قرآن وحدیث کو حسب مقتضیات زمانہ تمام جزئیات پر منطبق کرکے ان سے نتائج صحیحہ اخذ کرسکتے ہوں۔

ظاہر ہے کہ مجلس شوری کا رکن ہر ایک مسلمان ہو سکتا ہی، صرف قابلیت شرط ہی، دولت کی ضرورت نہیں، جس وقت وحی الٰہی نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مشاورت میں شریک ہونے سے قبل صدقہ دیا کریں، تو بعض نادار مسلمان اس کی شرکت سے رک گئے، حالانکہ وہ ہر طرح اس کے اہل تھے، صرف دولت

ان کے پاس نہ تھی، مگر فوراً اس قید کو دور کر کے ان کو شوریٰ میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی: ءاشفقتم ان تقدموا بین یدی نجوکم صدقت، فاذ لم تفعلوا و تاب اللہ علیکم، فاقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واطیعوا اللہ و رسولہٗ واللہ خبیر بما تعملون، (۵۸ : ۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات پیش کیا کرو ڈر گئے، پھر جب تم نے ایسا نہ کیا، اور خدا نے تمہیں معاف کر دیا تو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور خدا اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کرتے رہو اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے خبردار ہے۔

بعض لوگوں نے حضرت عمر پر یہ اعتراض کیا کہ وہ ابن عباس کو اپنی مجلس مشاورت میں شریک کرتے ہیں، حالانکہ ان کی عمر بہت کم ہے، اور ان صحابہ کی طرف توجہ نہیں کرتے جو اُن سے عمر اور تجربہ میں بڑھکر ہیں، اُنہوں نے اس نکتہ چینی کو سُن کر خاموشی اختیار کی، اور ایک روز تمام صحابہ کو بلا کر ہر ایک سے پوچھا کہ سورۂ نصر کا کیا مطلب ہے، ہر ایک نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، ابن عباس بھی ایک طرف کو بیٹھے ہوئے تھے، آخر میں ان سے دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے عرض کیا کہ اس سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اعلان ہے، آپ نے فرمایا کہ میرا بھی یہی خیال ہے، اس پر سب کے سب خاموش ہو گئے۔

صحابہ کا عام دستور تھا کہ وہ ازواج مطہرات سے مشورہ کیا کرتے تھے، ان سے بحث و مناظرہ ہوتا تھا، اور اکثر مسائل کا فیصلہ ان کی رائے کے مطابق ہوتا تھا۔

گویا مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے صرف قابلیت کو خلفائے راشدین کے زمانہ میں دیکھا جاتا تھا،

البتہ اس انتخاب میں مسلمانوں کا ایک فرض ہے جس کی حفظ و نگہداشت ان کا اولین فرض ہے، اور وہ یہ ہے کہ اپنا نمایندہ منتخب کرتے وقت وہ یہ اچھی طرح دیکھ لیں کہ جس کو ہم لسان قوم بنا کر مجالس ملیہ میں شرکت کا حق دے رہے ہیں، اس میں کوئی ایسی کمزوری تو موجود نہیں جس کو ترجمان الٰہی نے نفاق عمل سے تعبیر کیا ہے، یعنی اہلیت انتخاب پر غور کرتے وقت امور مذہبیہ کے ساتھ شغف اور خصوصاً تبلیغ حقانیت کے جذبہ صحیحہ کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اصول اساسی

جس مجلس کی ترتیب و تنظیم کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کے اغراض و مقاصد پر بھی قرآن نے پوری روشنی ڈالی ہے، ایک جگہ آتا ہے: یایھا الذین اٰمنوا اذا تناجیتم فلا تتناجوا بالاثم والعدوان ومعصیت الرسول وتناجوا بالبر والتقوٰی ط (۵۸ : ۹) مومنو! جب تم آپس میں سرگوشیاں کرنے لگو، تو گناہ اور زیادتی اور پیغمبر کی نافرمانی کی باتیں نہ کرنا بلکہ نیکوکاری اور پرہیزگاری کی باتیں کرنا، یہ بھی ہے: ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانت الیٰ اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل سورۂ نساء میں ہے: لاخیر فی کثیر من نجوٰھم الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس، (۴ : ۱۱۴) ان لوگوں کی بہت سی مشورتیں اچھی نہیں، ہاں اس شخص کی مشورت اچھی ہو سکتی ہے جو خیرات یا نیک بات یا لوگوں میں صلح کرنے کو کہے، آج کل یہ عام دستور ہے کہ جو عیسائی اقوام رنگین قوموں پر حکمراں ہیں، وہ رنگین اور سفید آدمی کے درمیان فیصلہ کرتے وقت اپنی قوم کا ساتھ دیتی ہیں، اور عدل و انصاف کی پروا نہیں کرتیں، کیونکہ اگر وہ حق پرستی کا خیال کریں، اور رنگین شخص کو سفید کے

مقابلہ میں کامیاب کردیں تو ان کے رعب میں فرق آجائیگا، مگر جو قومیں حق پرستی کی مدعی ہوں، اور تہذیب و شائستگی کی دعویدار ہوں، انہیں اس سے بلند تر ہونا چاہیئے: انا انزلنا الیك الکتٰب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰك اللہ ولا تکن للخائنین خصیما، (۴ : ۱۰۵) اے پیغمبر ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے تاکہ خدا کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات فیصل کرو، اور دیکھو دغابازوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا۔

قرآن حکیم نے مجالس شوریٰ کے ارکان کو حسب ذیل حکم دیا ہے: ولا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم ان تبروا و تتقوا و تصلحوا بین الناس، (۲ : ۲۲۴) اور خدا کے نام کو اس بات کا حیلہ نہ بنانا کہ اس کی قسمیں کھا کھا کر سلوک کرنے اور پرہیزگاری کرنے، اور لوگوں میں صلح و سازگاری کرنے سے رُک جاؤ۔ ہر سلیم الفطرت اس آیت سے یہ استنباط کر سکتا ہے کہ جو لوگ کسی حکومت کے تنخواہ دار ممبر ہو کر مجالس قانونی میں شریک ہوتے ہیں، ان پر باوجود حلف اطاعت اٹھا لینے کے حق و انصاف کی ذمّہ داری باقی رہتی ہے، اور جس کے لئے ان کو احکم الحاکمین کے دربار میں حاضر ہونا پڑیگا۔

مسئولیت

اب ہم سب سے آخر میں یہ بتانا چاہتے ہیں، اور اسی پر اپنی تمہید کو ختم کر دینگے کہ خود ان ارکان کی مسئولیت اور ذمہ داری کس قدر اہم ہے، انسان کو ہر قسم کی معصیت سے بچانے والا اگر کوئی خیال ہے تو وہ اپنی ذمہ داری کا احساس اور اللہ کا خوف ہے، اگر یہ چیز نہیں تو اسے کوئی چیز ارتکاب گناہ سے نہیں روک سکتی، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے باربار قیامت کا تذکرہ کیا ہے۔

ان ارکان خلافت کو مخاطب کرکے کہا جاتا ہی: للہ مافی السموت ومافی الارض وان تبدوا مافی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ، جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہی سب خدا ہی کا ہی، تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کردگے تو اور چھپاؤگے تو، خدا تم سے اس کا حساب لیگا، سورۂ نمل میں آتا ہی: وان ربك ليعلم ماتكن صدورهم ومايعلنون، (۲۷: ۷۴) اور جو باتیں ان کے سینوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور جو کام وہ ظاہر کرتے ہیں تمہارا پروردگار ان سب کو جانتا ہی۔ سورہ مجادلہ میں فرمایا: الم تر ان الله يعلم مافی السموٰت ومافی الارض، مايكون من نجوى ثلثة الا هو رابعهم ولاخمسة الا هو سادسهم ولا ادنیٰ من ذالك ولا اكثر الا هو معهم اين ماكانوا ج ثم ينبئهم بما عملوا يوم القيمة ط ان الله بكل شئ عليم (۵۸: ۷) کیا تم کو معلوم نہیں کہ جو کچھ آسمانوں میں ہی، اور جو کچھ زمین میں ہی خدا کو سب معلوم ہی، کسی جگہ تین شخصوں کا مجمع اور کانوں میں صلاح ومشورہ نہیں ہوتا مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہی، اور نہ کہیں پانچ کا مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہی، اور نہ اس سے کم یا زیادہ مگر وہ انکے ساتھ ہوتا ہی، خواہ وہ کہیں ہوں، پھر جو جو کام یہ کرتے رہے ہیں، قیامت کے دن وہ ایک ایک ان کو بتائیگا بیشک خدا ہر چیز سے واقف ہی۔

مگر یہ یاد رکھو یہ صرف الفاظ ہی نہ تھے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، بلکہ صحابہ کرام نے ان پر عمل بھی کرکے دکھا دیا، اور یہی ارباب ایمان ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہیں، حضرت ابوبکر کا اولین خطبہ تمہارے سامنے ہی، اس کا ایک ایک لفظ احساس ذمہ داری ومسئولیت سے بھرا ہوا ہی، وفات کے وقت انہوں نے تمام وہ رقوم بیت المال کو واپس کردیں جو انہوں نے تنخواہ کے طور پر وصول کی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

متعلق صرف ایک واقعہ کا ذکر کر دینا کافی ہی، ایک مرتبہ انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری
سے دریافت کیا کہ کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ ہم لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا، اللہ
کی راہ میں ہجرت کی، اور ہمیشہ رسول کی خدمت میں رہے، قیامت کے روز برابر سرابر
چھوٹ جائیں، نہ کوئی ثواب ملے، اور نہ عذاب ہو، ابو موسیٰ نے کہا، ہرگز نہیں، ہمنے
بہت سی نیکیاں کی ہیں، اور ہمیں ان کے ثواب کی توقع ہی، حضرت عمر نے یہ جواب سُنکر
کہا، خدا کی قسم، میں تو صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ مواخذہ نہ ہو، اور چھوٹ جاؤں، وفات
کے وقت ان کی زبان پر یہ شعر جاری تھا۔

ظلوم لنفسی غیر انی مسلم،
میں نے اپنے اوپر بہت ظلم کیا، البتہ یہ بات ضرور ہی کہ میں مسلمان ہوں،

اصلی الصلوٰۃ کلھا واصوم!
اور صوم و صلوٰۃ کا پورا پابند ہوں
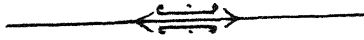
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الحجرات

(رکوع، ۲-آیات، ۱۸)

سورۃ کا نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس نہ صرف تلاوت آیات اور تعلیم کتاب ہی میں مصروف تھی، بلکہ تزکیہ نفوس اور تعلیم حکمت بھی اس کے سپرد تھی، وہ اگر مسجد میں نماز کے واجبات وسنن بتاتے تھے، تو فصل خصومات کے وقت قاضی بھی تھے، ایک طرف تو وہ اخلاق کی تہذیب وشائستگی کے معلم بنا کر بھیجے گئے تھے، تو دوسری جانب بدر اور احد کی لڑائیوں میں لڑنے والوں کے مقامات کی تعیین، طریق جنگ کی تعلیم، فوج کا نظم اور ڈسپلن بھی آپ ہی سے متعلق تھا، اگر فتح مکہ کے روز فاتح جرنیل کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوتے تھے، تو امت مسلمہ کی تشکیل وتنظیم، قوانین کی ترتیب وتدوین، خارجی سیاست کے اصول وضوابط، اور بین الاقوامی تعلقات وروابط بھی آپ ہی فرماتے تھے۔

پس جس قدسی صفت انسان کی یہ شان ہو، اس کا یہ بھی کام تھا کہ وہ مسلمانوں کو

ہر قسم کے اخلاق اور اعمال کی تعلیم دے، جو ان کو نہ صرف ایک مفید شہری بنا دے، بلکہ وہ عام نوع انسانی کے لئے فائدہ بخش اور نافع عضو ثابت ہوں، جن لوگوں نے رسول اللہ کے سوانح حیات کو سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے، وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ کوئی ایسا شعبہ حیات نہیں جس کے لئے آپ کی تعلیمات موجود نہ ہوں، اور جہاں آپ کے اسوۂ حسنہ نے ہماری راہ نمائی نہ کی ہو۔

فتوحات کا زمانہ ہے، تمام عرب میں اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے، ہر طرف سے قبائل اسلام قبول کرنے کی غرض سے مدینۃ النبی میں حاضر ہو رہے ہیں، دربار رسالت میں وفود اپنے اپنے شعوب وقبائل کی طرف سے اسلام اور وفاداری کا اظہار کر رہے ہیں، ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو اجتماعی اور سیاسی زندگی کے مراتب مختلفہ کے متعلق ایک مرتب ومدون قانون دیا جائے، جو ان کے ہر گوشۂ حیات میں مشعل راہ کا کام دے سکے، اور انہیں کسی جگہ بھی ٹھوکر نہ لگے۔

مسند امام احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ اقرع بن حابس تمیمی دربار رسالت میں حاضر ہوئے، اتفاق سے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاشانۂ نبوت میں تشریف رکھتے تھے، یہ لوگ زیادہ انتظار نہ کر سکے، اور مکان کے باہر ہی سے یا محمد، یا محمد کہکر پکارنا شروع کیا، جب آپ نے اندر سے کوئی جواب نہ دیا تو اقرع نے زور سے کہا: ان حمدی زین وان ذمی شین میری زبان سے کسی شخص کی مدح وستائش اس کی زینت کا باعث ہو جاتی ہے، اور میں نے جس کی مذمت کی پھر اس کی تعریف کرنے والا کوئی نہیں، آپ نے فرمایا کہ یہ بات صرف اللہ کے اختیار میں ہے، ابن جریر نے ایک دوسری روایت بیان کی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ زید بن ارقم نے رسول اللہ کو اطلاع دی کہ چند لوگ آپکی خدمت میں

حاضر ہونا چاہتے ہیں، اور انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا ہے: انطلقوا بنا الی ھذا الرجل فان یك نبیا فنحن اسعد الناس به، وان یك ملکا نعش بجناحه، چلو اس شخص کے پاس چلیں، اگر وہ نبی ہوئے تو ہم سے بڑھکر خوش بخت اور کون ہوگا، اور اگر وہ بادشاہ ہوئے تو اس کے سایۂ عاطفت میں آرام سے زندگی بسر کرینگے۔ مگر جس وقت یہ لوگ آپ سے ملنے کے لئے آئے، تو آپ مسجد میں نہ تھے، اور انتظار کئے بغیر آپ کو آواز دینا شروع کر دی۔

یہ بات ادب اور تہذیب کے خلاف تھی، اور حضرت رسالت کا رعب و اقتدار لوگوں کے دلوں سے اُٹھ سکتا تھا، اسلئے اس طرز عمل کی ممانعت کی گئی، اور ایک مستقل قانون نوازش کیا گیا جو تمام اصول و کلیات پر حاوی تھا، اور چونکہ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکان کے باہر سے آواز دی تھی، اس لئے اس کا نام الحجرات تجویز ہوا۔

ترتیب نزول

اس میں تو کسی کو بھی اختلاف نہیں کہ یہ تمام سورۃ مدینہ مبارکہ میں نازل ہوئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں وفد بنو تمیم کا تذکرہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکان سے باہر پکارنا شروع کر دیا تھا، دفود کی آمد ۹ سنہ ہجری میں شروع ہوئی ہے، اور اسی سال آپ نے ولید کو بنو مصطلق سے صدقات وصول کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا لہذا یہ ثابت ہوگیا کہ اس سورت کا نزول بھی ۹ سنہ ہجری میں ہوا ہے۔

ماقبل سے ربط

سورۂ فتح میں مسلمانوں کو ایک عظیم الشان فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی تھی،

انہیں یقین تھا کہ ہم اسی سال مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہونگے، مگر جب رسول اللہ اپنے اعوان و انصار کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے تو حدیبیہ کے میدان میں آپ کو کفار نے روک لیا، اور بالآخر کار وہ مشہور عہد نامہ مرتب ہوا جس پر بعض پرجوش صحابہ نے اپنی ناخوشی کا اظہار کیا، مگر انجام کار تبلیغ اسلام کے لئے یہی مہلت حقیقتاً فتح مبین ثابت ہوئی، اسلئے سورۂ حجرات کے ابتدا ہی میں یہ فرما دیا: لا تقدموا بین یدی اللہ و رسولہ، گزشتہ سورت میں فرزندان اسلام کو نصرت و کامگاری کی مسرت اندوز خبر دی گئی تھی، ضروری تھا کہ اس کے لئے مسلمانوں کو تیار کیا جاتا، اور انہیں حکومت کے نظم و نسق، انتخاب خلیفہ، مجلس شوریٰ کے قیام، مسلمانوں کے باہمی تعلقات، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی تشکیل و ترتیب کی تعلیم دی جاتی، اس غرض کو منجملہ دیگر سور کے سورۂ حجرات نے پورا کیا۔

اگر ہم قوموں کے عروج و زوال کے مسئلہ پر غور کریں، اور ان کے علو و تسفل، اور صعود و ہبوط کے اصول و کلیات مرتب کرنا چاہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک قوم مراتب ارتقاء طے کرتی ہی تو عموماً اس میں اکثر اخلاق فاضلہ اور شریفانہ جذبات ہوتے ہیں، جو فضیلت و برتری کے لئے ضروری اور لازمی ہیں، مگر یہ عام طور پر دیکھا گیا ہی کہ جب ان کی مملکت وسیع ہوتی ہی، اور زمین اپنے مدفون خزائن کے دروازے ان کے لئے کھول دیتی ہی تو ان میں آرام طلبی، عیش پرستی، فنون لطیفہ کا شوق، غیبت و نمامی، بغی و عدوان اور اسی قسم کے فاسقانہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، ان بد اخلاقیوں کے رونما ہوتے ہی ان کا رخ تنزل و انحطاط کی طرف ہو جاتا ہی، اس لئے سورۂ فتح کے بعد ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ان امور پر متنبہ کر دیا جاتا کہ ان میں یہ امراض خبیثہ نہ

[illegible] اس سورت میں انہیں امور کی تعلیم دی گئی۔

سورۂ فتح میں مسلمانوں کے مراتب عالیہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا: محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم ترٰھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھہم من اثر السجود ذالک مثلھم فی التورٰۃ ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطاٗہ فازرہ فاستغلظ فاستوٰی علٰی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بہم الکفار وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت منہم مغفرۃ واجرا عظیما (۴۸: ۲۹) محمد خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں، اور آپس میں رحم دل، اے دیکھنے والے تو ان کو دیکھتا ہے کہ خدا کے آگے جھکے ہوئے سر بسجود ہیں، اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں، کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں، ان کے یہی اوصاف تورات میں مرقوم ہیں، اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں، وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے پہلے زمین سے سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر موٹی ہوئی، اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی، اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے، جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان سے خدا نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے، اس لئے سورۂ حجرات میں انہیں تنبیہ کر دی گئی کہ وہ ان تمام حرکات سے پرہیز کریں جو انہیں ان درجات سے گرا دینگی، ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون، (۴۹: ۲) اور پھر اپنے شرف و مزیت کو کھو کر شر البریہ بن جائیں،

تلخیص مضامین

یہ سورۂ مبارکہ اگرچہ کچھ زیادہ لمبی نہیں، اور اس کی کل اٹھارہ آیات ہیں، مگر دراصل اسی مختصر سورت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نظام حکومت پر بہترین درس دیا ہے، یہ سورۃ ایک مکمل ضابطہ اور دستور العمل ہے جس کی اساس و بنیاد پر ہم قوانین و ضوابط کی ایک عظیم و جلیل عمارت قائم کر سکتے ہیں۔

ابتدائی آیات کی نسبت تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ وفد بنو تمیم کے متعلق نازل ہوئی ہیں، شروع کی پانچ آیتوں میں ان آداب و مراسم کو بیان کیا گیا جن کی حفظ و نگہداشت ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے جب وہ دربار رسالت میں حاضر ہو، رسول سے قبل کسی کام کا کر لینا، ان کے حضور میں زور زور سے بولنا، عام لوگوں کی طرح ان سے بات چیت کرنا، اور کاشانۂ نبوت کے باہر کھڑے ہو کر ان کو پکارنا تہذیب و شائستگی اور شان نبوت کے خلاف ہے، ان باتوں سے پرہیز کرنا مسلمان کا اولین فرض ہے۔

آیت نمبر ۶ سے نمبر ۸ تک یہ بتایا گیا ہے کہ جب کبھی دنیائے اسلام یا بلاد خارجہ میں کوئی حادثہ پیش آئے تو کسی مسلمان کو اس پر رائے قائم کرنے، اور اپنے لئے راہ عمل معین کرنے کا حق نہیں ہے جب تک اس کی اطلاع دربار رسالت میں نہ کر دی جائے، انہیں موقعہ دینا چاہئے کہ وہ تمام حالات و واقعات کا درس و مطالعہ کر کے کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ تمام لوگ سوچے سمجھے بغیر غلط نتائج اخذ کر کے ان پر عمل کرنا شروع کر دیں، اور اس طرح تمام قوم کو مصیبت میں ڈال دیں، اس طریق کار سے ملک کا نظم و نسق بھی خراب ہو جائیگا، اور خارجی تعلقات پر بھی اس کا بہت بڑا اثر پڑیگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ایک ایسی برادری کی بنیاد ڈال دی ہے،

جس میں کسی قسم کا فرق و امتیاز نہیں، جس میں ابیض و اسود، زنگی و رومی، اور ہندی و چینی برابر ہیں، جس میں رنگت و نسل، اور آب و ہوا کو کوئی دخل نہیں، جو ان تمام امور سے بالاتر صرف رشتہ اسلام پر نظر رکھتی ہی، جس میں بادشاہ اور گدا ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑے نظر آتے ہیں، اور رسول اللہ ان سب کے والد ہیں: النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھتھم (۳۳ : ۶) پس جب تمام دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی آپس میں جنگ رسول اللہ کے لئے کس قدر رنج اور تکلیف کا باعث ہوگی۔ اس لئے یہ فرض قرار دیا گیا کہ اگر خدانخواستہ مسلمانوں کی کوئی دو جماعتیں آپس میں لڑنے لگیں، تو باقی سب لوگوں کا فرض ہی کہ ان میں صلح کرا دیں، گویا اس طرح ہم اس ادب و احترام کو ملحوظ رکھیں گے جو ہر مسلمان کو رسول اللہ کا بحیثیت والد ہونے کے کرنا چاہیے، آیت نمبر ۹ و ۱۰ میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہی۔

آیت نمبر ۱۱ سے ان امور کو بیان کیا جاتا ہی جو بہت سے فسادات کا باعث ہوتے ہیں، جو تمدن کے لازمی نتائج ہیں، اور جن کا نتیجہ قتل و خونریزی ہی، اگر ان امراض سے مسلمان اپنے آپ کو بچائینگے، اور ان مفاسد سے اپنے دامن کو آلودہ ہونے سے محفوظ رکھیں گے، تو مسلمانوں میں جنگ ہی نہ ہوگی، بلکہ سب کے سب بھائیوں کی طرح زندگی بسر کرینگے، اور اس قسم کی اخلاقی خرابیاں ان لوگوں میں پیدا ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو معزز و محترم اور دوسروں کو حقیر و ذلیل خیال کرتے ہیں، اس لئے آیت نمبر ۱۳ سے یہ حقیقت واضح کر دی کہ شعوب و قبائل، اور انساب و ارحام قابل فخر و مباہات نہیں ہیں، اصل چیز بر و تقویٰ اور خشیت الٰہی ہی، اسی سے انسان کے مدارج میں ترقی ہوتی ہی، اور یہی اللہ کو عزیز و محبوب ہی، لیکن اللہ کے سوا کون یہ فیصلہ کر سکتا ہی کہ فلاں شخص حقیقت میں متقی، اور اللہ کے نزدیک

قابل عزت ہی، ممکن ہی کہ جس کو تم ادنیٰ خیال کرتے ہو وہی اللہ کی نظر میں اعلیٰ ہو، اسلئے ان امراض سے بچو، اور شریفانہ زندگی بسر کرنے کی کوشش کرو،

آخر میں فرمایا کہ انسان کی سب سے بڑی سعادت وخوش بختی یہ ہی کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا، تمام دنیا کے مسلمان اس کے بھائی بن گئے، بادشاہ اور فقیر میں کوئی فرق نہ رہا، اور ترقی کی تمام راہیں اس کے سامنے کھل گئیں، اب وہ ادنیٰ ترین زندگی سے نکل کر تقویٰ اور مکارم اخلاق کے ذریعہ دنیا کا سب سے بڑا انسان بھی بن سکتا ہی، یہ مساوات اور برابری دنیا کے اور کسی مذہب میں موجود نہیں، کسی مذہب نے تو ادنیٰ اقوام کو مذہبی کتب کے درس و مطالعہ سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا ہی، کسی نے ادنیٰ اور اعلیٰ قسم کے لوگوں کے لئے الگ الگ عبادت گاہیں مقرر کر رکھی ہیں، بعض مذاہب ہیں کہ ان میں کوئی دوسرا آدمی شامل ہی نہیں ہو سکتا، مگر اسلام ان سب سے بالاتر، سب کے لئے یکساں، اور سب پر اپنی برکات نازل کرتا ہی، اس لئے یہ نہ سمجھو کہ تم نے مسلمان ہو کر اسلام و خدائے اسلام پر کوئی احسان کیا ہی، بلکہ یہ اللہ کا فضل مخصوص ہی کہ اس نے تمہاری راہ نمائی کی، اور تمہیں راہ حق اختیار کرنے کی توفیق بخشی، پس اس خدا کا شکر ادا کرو جس نے تم کو دائرہ اسلام میں داخل کیا، اور اسی پر سورہ حجرات کو ختم کر دیا۔

موضوع سورت

گزشتہ سطریں پڑھ لینے کے بعد ہر ایک شخص بآسانی یہ بات معلوم کر سکتا ہی کہ اس سورۂ مبارکہ کا موضوع کیا ہی، اس کو اول سے آخر تک دیکھنے کے بعد پتہ لگ جاتا ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور صحبت و ہم نشینی کا یہ اثر تھا کہ آپ نے شتربانوں کو جہانبان بنا دیا، ان لوگوں نے قلیل ترین زمانہ میں اتنی ترقی کرلی

جو رومن امپائر کو تین سو سال میں بھی نصیب نہ ہوئی تھی، آپ کی حیات مقدس ہی میں عرب پر اسلامی حکومت کا جھنڈا لہرانے لگا، رومیوں نے آپ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، اور خود آپ نے بھی بارہا فرزندان اسلام کو یہ خوش خبری دی کہ وہ بہت جلد قیصر کسریٰ کے بلاد و امصار پر قابض ہو جائیں گے، وکان امر اللہ مفعولا۔

وہ قوم جو خیر امت اخرجت للناس کے لقب سے سرفراز تھی، جو شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز تھی، جو امۃ وسطا کے نام سے موسوم تھی، جس کا طغرائے امتیاز ہی لیظھرہ علی الدین کلہ تھا، اور جس کی تخلیق ہی صرف اس لئے عمل میں آئی تھی کہ وہ تمام اقوام عالم کی نگراں ہو، سب پر حاکم ہو کر رہے، اور سب کو عدل، مساوات، اور جمہوریت کا سبق دے، جو حق و صدق کی علمبردار، قوموں کی حریت و آزادی کی ذمہ دار، ضعیفوں اور کمزوروں کی معاون و مددگار، اور مظلوموں اور بیکسوں کی غمخوار و غمگسار ہو، ضرور تھا کہ اسے وہ ضابطہ اور قانون نوازش کیا جاتا جو نہ صرف اس کی داخلی و خارجی زندگی کے لئے بہترین دستور العمل ہوتا، بلکہ دوسروں کے لئے بھی مشعل راہ ہدایت ثابت ہوتا۔

قرآن نہ صرف ایک مذہبی کتاب ہے جس میں نماز اور روزہ کی تعلیم دی گئی ہے، بلکہ وہ بہترین فلسفہ، قوت نظریہ کا تربیت کرنے والا، قوت عملیہ کے لئے اعلیٰ ترین دستور العمل، عملی زندگی کے لئے بہترین قانون، مذہب و ادبیات کا معلم، سیاسیات و اجتماعیات کا مؤسس، عمران و اقتصادیات کا مقنن، اور روزمرہ زندگی کے لئے ایک ضابطہ ہے۔ جس وقت تمام دنیا جہالت اور تاریکی میں مبتلا تھی، ہر طرف جابرانہ شخصی حکومتیں قائم تھیں، قرآن حکیم نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی، جو سب سے جدا، اور سب سے اعلیٰ تھی، جس میں قوم کے لوگ، قانون الٰہی کے مطابق اس پر حکمرانی کرتے تھے، اور نہ صرف

قوم کی فلاح وبہبود ان کے پیش نظر ہوتی تھی، بلکہ نوع انسانی کی خیر خواہی، حق وصداقت کی نشر واشاعت، اور تمرد وسرکشی کا استیصال ان کا مقصد تھا۔

اگرچہ آج کل کی سیاسی لغت میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو اس انداز حکومت کا صحیح مفہوم ادا کرسکے جس کو کتاب وسنت کی روشنی میں خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا، مگر ہم بدرجہ مجبوری لوگوں کو سمجھانے کی خاطر، اور اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اس ناقص ترین اصطلاح کو اختیار کرتے ہیں جس کو جمہوریت کہا جاتا ہی، قرآن نے اس کی تعلیم دی، اس کے اصول وکلیات بیان کئے اور اس کی تشکیل وتنظیم کے تمام اسباب ومراتب بیان کئے کہ بحث ونظر کا کوئی گوشہ باقی نہ رہے۔

سورۂ حجرات اسی جمہوریہ اسلام پر بحث کرتی ہی، خلیفہ امت کے لئے جن آداب ومراسم کا بجالانا ضروری ہی ان کو واضح کرتی ہی، مجلس شوریٰ کے حدود واختیارات پر روشنی ڈالتی ہی، اور ان امراض ومفاسد کو بیان کرتی ہی جو اس نظام کے لئے تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہیں، اور یہی اس سورۂ مبارکہ کا موضوع حقیقی ہی۔

انتباہ

سورۂ حجرات کی تفسیر آگے آتی ہی، مگر ہم چاہتے ہیں کہ تفسیر لکھنے سے قبل قارئین کرام پر یہ واضح کردیں کہ قرآن کی آیات میں جس قدر آداب ومراسم کا تذکرہ کیا گیا ہی وہ قرآن کے الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہیں، مگر یہ ظاہر ہے کہ آپ اس وقت ہم میں موجود نہیں، کہ ہمیں ان امور کا خیال رکھنا پڑے، لیکن قرآن بدستور رہیگا قیامت تک اسی طرح رہیگا، اور اسی انداز میں وہ ایک ایک مسلمان کو مخاطب کرکے کہیگا: لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ، ۔

مفسرین کرام اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگرچہ قرآن کی آیات مخصوص واقعات کی بنا پر معین اشخاص کے حق میں نازل ہوئی ہوں مگر ان کا مفہوم ہمیشہ عام لیا جائیگا، علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: اختلف اہل الاصول ہل العبرۃ بعموم اللفظ او بخصوص السبب، والارجح عندنا الاوّل۔

ظاہر ہے کہ یاایہا الذین اٰمنوا کے اولین مخاطب تو صحابہ کرام ہی تھے، مگر آج ہم بھی اس کے ویسے ہی مخاطب ہیں جس طرح وہ تھے، اور ہم سے بھی انہیں آداب کو ملحوظ خاطر رکھنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جیسے ان سے تھا، اس لئے ہم نے اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر میں اس امر کی توضیح کر دی ہے کہ اگرچہ ان مراسم احترام کی اصلی حقدار تو رسول اللہ ہی کی ذات اقدس ہے مگر وہ ارباب تقویٰ وطہارت بھی ان کے اہل ہونگے جن کو آپکی جانشینی کا فخر حاصل ہوگا، جن کے ہاتھ میں امت مسلمہ کی زمام حکومت ہوگی، جو مسلمانوں کی داخلی وخارجی سیاست وتہذیب کے ذمہ دار ہونگے اور جن کو خلیفہ اور امیر کے نام سے موسوم کیا جائیگا، پس ارباب نظر ہماری تفسیر پڑھتے وقت اس نکتہ کو فراموش نہ کریں، وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضی فی القول والعمل والاعتقاد۔

باب
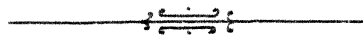
خلیفہ اُمّت کے آداب

فصل اوّل

شانِ نزول

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○

مومنو! کسی بات کے جواب میں خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اُٹھا کرو، اور خدا سے ڈرتے رہو، بیشک خدا سنتا جانتا ہے۔

بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ بنو تمیم کا وفد دربارِ رسالت میں حاضر ہوا تو حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ قعقاع بن کو ان کا سردار بنا دیجیے، مگر حضرت عمرؓ نے ان کی جگہ اقرع بن حابس کا نام پیش کیا، ابو بکرؓ نے ناراض ہو کر ان سے کہا: ما اردت الا خلافی، محض میری مخالفت کی خاطر آپ نے یہ دوسرا نام پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں یہ بات مخالفت کے طور پر نہیں کہتا: فتماریا حتی ارتفعت اصواتھما، وہ جھگڑتے رہے یہاں تک کہ ان کی آواز بہت بلند ہو گئی، اس پر

یہ آیت نازل ہوئی، قتادہ کہتے ہیں: ذکر لنا ان ناسا کانوا یقولون لو انزل فی کذا وکذا موضع کذا وکذا، ہم سے کہا گیا کہ بعض لوگ یوں کہا کرتے تھے کہ اگر فلاں حکم کی جگہ دوسرا حکم نازل ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ باتیں ناپسند آئیں اور ممانعت میں یہ آیت نازل کی، حضرت حسن فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ قربانی کے روز لوگوں نے رسول اللہ سے قبل اپنے جانور ذبح کرنے شروع کر دیئے، تو یہ آیت نازل ہوئی، اور آپ نے ان لوگوں کو دوبارہ جانور ذبح کرنے کا حکم دیا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں: کان الناس یتقدمون بین یدی رمضان بصیام یعنی یوما او یومین، رمضان شروع ہونے سے دو ایک روز قبل لوگ روزے رکھنے شروع کر دیتے تھے، تو اس کی ممانعت میں یہ آیت اتری۔

حضرت عبداللہ بن عباس اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں: لا تقولوا خلاف الکتاب والسنۃ، کتاب وسنت کے خلاف کوئی بات نہ کہو، ابن جریر نے ان کی طرف یہ معنی بھی منسوب کئے ہیں: نہوا ان یتکلموا بین یدی کلامہ، رسول اللہ سے قبل بات کرنے کی ممانعت کی گئی، جابر بن عبداللہ کہتے ہیں: لا تصوموا قبل ان یصوم نبیکم، اپنے نبی سے قبل روزہ نہ رکھو، مجاہد کی رائے ہے: لا تفتانوا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیء حتی یقضی اللہ تعالیٰ علی لسانہ، ضحاک کا قول ہے: لا تقضوا امرا دون اللہ ورسولہ من شرائع دینکم، اللہ اور رسول کے بغیر شریعت کی کسی بات کا خود فیصلہ نہ کرلو، اسی ذیل میں یہ روایت بھی سامنے رکھئے جو ترمذی، نسائی اور مسند امام احمد میں موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف روانہ فرمایا تو ان سے پوچھا کہ تم کس طریق پہ فیصل

خصومات کروگے۔ انہوں نے جواب دیا: بکتاب اللہ، اور اگر کتاب الٰہی میں تمہارے سوال کا جواب نہ ہو تو انہوں نے کہا: بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور اگر وہ بھی خالی ہو تو پھر کیا کروگے، تو معاذ نے عرض کیا: اجتہد برائی اس پر رسول اللہ نے ان کی چھاتی پر ہاتھ مار کر فرمایا: الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ خدا کا شکر ہی جس نے میرے فرستادہ کو اس امر کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول خوش ہوتا ہی۔

تقدیم کی ممانعت

یہ تمام روایات اور صحابہ کرام کے اقوال تمہارے سامنے ہیں، وہ گو بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہوں مگر در اصل ان میں کوئی اختلاف نہیں، ایک ہی آیت ہی جس سے مختلف مسائل کا استنباط کیا جا رہا ہی، اور اس کے جس قدر متبادر مطالب اور معانی ہوسکتے ہیں ان کو پیش کیا جا رہا ہی، ان سب کی غرض یہ ہی کہ اگرچہ یہ آیت وفد بنو تمیم کے حق میں نازل ہوئی ہی، اور وہ ایک جزئی واقعہ ہی، مگر اسی آیت سے ایک قاعدہ کلیہ مستنبط ہوتا ہی جو ہمیشہ کے لئے تمام مسلمانوں کے واسطے مشعل راہ اور دلیل ہدایت ثابت ہوگا، اور وہ یہ ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناموس الٰہی کی معرفت ہر ضروری بات کا الہام کر دیا جاتا ہی، جسکو دوسرے لوگ باوجود سخت ترین مجاہدات و ریاضات کے بھی معلوم نہیں کر سکتے، وہ جو کچھ کہتا ہی، وحی کی بنا پر کہتا ہی: وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ، اس لئے تم سب کا اولین فرض یہ ہی کہ ہر بات میں تم اس کا اتباع کرو: لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ، تمہارے لئے اللہ کے رسول میں پیروی کے لئے بہترین نمونہ ہی، جب کبھی کوئی جھگڑا ہو تو اسی کے فیصلہ کی طرف رجوع کرو:

وان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول، اس کے فیصلہ کو آخری اور قطعی تسلیم کرو: اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ، جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کرلیں تو پھر ان کو کسی قسم کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اسی کے اتباع سے تم محبت الٰہی کو بھی حاصل کرسکتے ہو: ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ، وہ رحمۃ اللعالمین ہیں، وہی سراج منیر ہیں، اور انہیں کے تمام اعمال حیات قرآن کی عملی تفسیر ہیں: کان خلقہ القرآن، اس لئے ایک مسلمان کو ایک لمحہ کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ سے مشورہ کئے بغیر، اور ان کے نمونہ کو ترک کرکے خود اپنی طرف سے اپنے لئے کوئی راہ عمل معین کرلے، کسی بات میں اسے فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں جبتک وہ رسول اللہ کی طرف مراجعت کرکے اس کی رائے معلوم نہ کرلے۔

قاعدہ کلیہ

یہ ایک طے شدہ بات ہی کہ قرآن حکیم کا روئے سخن عالمگیر ہے: تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعٰلمین نذیرا، اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دار فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، اس میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجایش نہیں کہ دنیا میں ہر آن و ہر لمحہ تغیر و تبدل ہوتا ہے، جدید واقعات و حوادث رونما ہوتے ہیں، نئی احتیاجات وضروریات سامنے آتی ہیں، اور بہر مرتبہ نامعلوم حقائق مستورہ بے حجاب ہوتے ہیں، ان سب کے لئے جب کبھی راہ عمل کی تلاش ہوگی تو ہم کتاب وسنت ہی کی طرف رجوع کرینگے کہ اسی سے صحیح روشنی ملسکتی ہی: وانزلنا الیکم نورا مبینا، (۴ : ۱۷۵) اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین نازل کیا ہے، لیکن یہی قرآن حکیم کہتا ہے: یایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا

الرسول واولی الامر منکم، رسول اللہ فرماتے ہیں: اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر وعمر، میرے بعد ابوبکر وعمر کا اتباع کرنا، یہ بھی آیا ہے: علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کرو، ایک اور حدیث میں ہے: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم، میرے تمام دوست نجوم کی مانند ہیں ان میں سے جس کا اتباع کروگے ہدایت پاؤگے، ساتھ ہی حضرت معاذ کی روایت بھی فراموش نہ کیجئے جو ابھی ابھی اوپر گذر چکی ہے، ایک مرتبہ آپ نے نجات پانے والی جماعت کے متعلق فرمایا: ما انا علیہ واصحابی، جو لوگ میرا اور میرے صحابہ کا طریق عمل اختیار کرتے ہیں۔

تو ان تمام روایات سے یہی قاعدہ کلیہ مستنبط ہوتا ہے کہ جب اس قسم کے حوادث پیش آئیں جو زمانہ رسالت میں ظہور پذیر نہ ہوئے تھے تو اس وقت مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے حکام اور امرا کی پیروی کریں جن کو انھوں نے خود مسلمانوں ہی میں سے اپنا خلیفہ یا والی مقرر کیا ہے۔

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ اصل آیت پر غور کریں، جس کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر ضروری معاملہ میں اپنے اولی الامر کی طرف رجوع کریں، نزول قرآن کے وقت یہ درجہ بلاشبہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر تھا، مگر آپ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کو یہ عزت ملی، اور وہی مرتبہ اب خلیفۂ اسلام کو حاصل ہے، جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے اور مشورہ سے انتخاب کیا ہو۔

رفع صوت

(۲) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ، (۳) اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ط لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ○

اے اہل ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو، اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، اس طرح انکے روبرو زور سے نہ بولا کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں، اور تم کو خبر بھی نہ ہو، جو لوگ پیغمبر خدا کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، خدا نے ان کے دل تقوی کے لئے آزما لئے ہیں، ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔

ان آیات کا شان نزول بھی وہی وفد بنو تمیم کا واقعہ ہے، ابن الزبیر کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر کی یہ کیفیت تھی کہ جب وہ دربار رسالت میں حاضر ہوتے تو ادب و احترام کی وجہ سے نہایت ہی آہستہ گفتگو کرتے یہاں تک کہ بعض اوقات رسول اللہ کو ان سے دریافت کرنا پڑتا: فما کان عمر رضی اللہ عنہ یسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی یستفہمہ، حضرت ابوبکر پر اس وحی الٰہی کا یہ اثر پڑا کہ انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنا یہ دستور بنا لیا: یارسول اللہ! واللہ لا اکلمک الا کاخی السرائر حتی القی اللہ، یارسول اللہ! میں مرتے دم تک آپ سے اس طرح باتیں کرونگا جس طرح کوئی شخص کسی سے رازدارانہ گفتگو کرتا ہے۔

اسی آیت کے متعلق بخاری نے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ رسول اللہ نے دیکھا کہ ثابت بن قیس کئی روز سے آپ کی خدمت حاضر نہیں

ہوئے، ایک شخص نے عرض کیا کہ میں اس کا پتہ لگاتا ہوں، چنانچہ وہ ان کے پاس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ثابت سر جھکائے ہوئے غمگین بیٹھے ہیں، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے: شر، کان یرفع صوته فوق صوت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقد حبط عملہ فھو من اھل النار، میں نے اپنی آواز کو رسول سے بلند کر دیا تھا جس کی وجہ سے میرے تمام اعمال ضائع گئے اور میں دوزخی بن گیا، انہوں نے یہی قصہ آکر رسول اللہ سے بیان کر دیا، آپ نے فرمایا کہ جاؤ اس سے کہدو: انك لست من اھل النار، ولکنك من اھل الجنة، یہ خیال غلط ہے تم دوزخی نہیں بلکہ جنتی ہو۔ مسند امام احمد میں حضرت انس سے اتنا اور یہی مروی ہے: فکنا نراہ یمشی بین اظھرنا، ونحن نعلم انه من اھل الجنة، فلما کان یوم الیمامة کان فینا بعض الانکشاف، فجاء ثابت بن قیس بن شماس، وقد تحنط راسه، ولبس کفنه، فقال بئسما تعدون اقرانکم، فقاتلھم حتی قتل رضی اللہ عنه، پھر وہ ہم میں چلا پھرا کرتے تھے، اور ہمیں ان کے جنتی ہونے کا یقین تھا، چنانچہ جنگ یمامہ میں وہ خوشبو لگا کر اور کفن پہن کر آئے، اور لڑے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

حضرت عمر رفع صوت میں بجد تشدد سے کام لیتے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے دو شخصوں کو مسجد نبوی میں بلند آواز سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو انہیں ڈانٹ کر کے کہا: اتدریان این انتما، تمہیں خبر بھی ہے تم کس جگہ ہو، پھر ان سے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو، معلوم ہوا کہ طائف کے باشندے ہیں، حضرت عمر نے فرمایا: لو کنتما من اھل المدینة لاوجعتکما ضربا۔ اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا۔

رفع صوت کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی اس آیت میں روکا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم رسول اللہ کو اس طرح مخاطب نہ کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو مخاطب بنایا کرتے ہو، اور اس کے بعد کی آیت میں ان دونوں کے نتائج بھی بتا دیے کہ ان جرائم کی پاداش میں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔

ضیاع اعمال

اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کو آپ نے اپنا خلیفہ اور رئیس جمہوریہ منتخب کیا ہے، ضرورت تھی کہ اسکے آداب و مراسم، اور حقوق و مراعات کو صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا جاتا، ایک ایسی قوم جو آگے چلکر تمام دنیا کی راہ نمائینگی،: وکذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء على الناس، جس کی برادری میں تمام اقوام عالم شریک ہونگی، اس کے لئے ایک مرتب و مدون نظام عمل، اور جامع وحاوی دستور و قانون کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہر قسم کی غلط کاریوں اور بداعمالیوں سے بچ سکے، اور اس کی حسن معاشرت سب سے خراج تحسین وصول کر سکے، اس لئے ان آیات میں ان آداب کو بیان کیا گیا جن کی پابندی نہ صرف مجلس شوریٰ کے تمام ارکان پر لازم ہوگی، بلکہ وہ لوگ بھی ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور ہونگے جو خلیفہ اسلام کے دربار میں شرف باریابی حاصل کرینگے، ان مراسم کی نگرانی ہر ایک شخص کا فرض اولین ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اعمال کی جزا خداوند تعالیٰ نے ہمیشہ ان اعمال کے مناسب ہی مقرر فرمائی ہے، مثلاً قیامت میں متکبرین کو بہت چھوٹے چھوٹے جسم کیڑے مکوڑوں کی طرح دیے جائینگے، اور ہر سلیم الفطرت سمجھ سکتا ہے کہ متکبرین کے لیے یہ کس قدر مناسب سزا ہے، قرآن میں آتا ہے کہ منافقین اور مومنین کے درمیان صرف ایک دروازے کا

فرق ہوگا جس کا وہ رخ تو نہایت ہی خوشگوار ہوگا جو ارباب ایمان کی طرف ہے، اور منافقین کی جانب موجب عذاب، یوم یقول المنفقون والمنفقت للذین اٰمنوا انظرونا نقتبس من نورکم ج قیل ارجعوا وراء کم فالتمسوا نورا ط فضرب بینہم بسور لہ باب ط باطنہ فیہ الرحمۃ وظاہرہ من قبلہ العذاب، (۵۷ : ۱۳) اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مومنوں سے کہینگی کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں، تو ان سے کہا جائیگا کہ پیچھے کو لوٹ جاؤ اور وہاں نور تلاش کرو، پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کردی جائیگی، جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے اس میں تو رحمت ہے، اور جو جانب بیرونی ہے اسطرف عذاب اور اذیت ہے۔ اب غور کرو کہ اہل نفاق کے لئے اس سے زیادہ مناسب اور کیا سزا ہو سکتی تھی۔

پھر اعمال پر عمیق نظر ڈالی جائے تو بعض کام ایسے بھی ہونگے جن میں انسان کے قصد اور ارادہ کو بہت ہی کم دخل ہوتا ہے، مثلاً تم نے غصّہ میں آکر کسی شخص کے ایک تھپڑ مار دیا، اور وہ شخص یا تو بوجہ جسمانی کمزوری کے ۔ یا تھپڑ کے کسی عضو ضعیف پر واقع ہوجانے کے مرگیا، تو اگرچہ تمہارا قصد اس کا ہلاک نہ تھا، لیکن اس کی موت واقع ہوجانے سے تمہارا جرم قانون کی نظر میں صرف تھپڑ کا مارنا نہوگا، بلکہ اس سے بہت زیادہ، گو قانونی طور پر تم کو سزائے قتل نہ دی جائے، غرض کہ اعمال کی قدر و قیمت اگرچہ بہت کچھ فاعل کے قصد اور ارادہ پر موقوف ہے، لیکن بعض اوقات جیسا کہ مذکورہ بالا مثال سے واضح کیا گیا ہے، مفعول کے حالات اور ماحول کے اثرات کو نتیجہ عمل کی تعیین میں بہت کچھ دخل ہوجاتا ہے، اور اس آیت کریمہ میں دراصل اسی نکتہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے،

یعنی اگر کوئی شخص بلا ارادہ گستاخی ہی ایسے امر کا مرتکب ہوگا، کہ جسکو قوانین تہذیب نے گستاخی یا بے ادبی کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے، تو وہ گستاخ ہی سمجھا جائیگا، اور اس کو گستاخی کی سزا بھگتنی پڑیگی، اہل قانون کے اصول موضوعہ میں سے ایک کلّیہ بہت مشہور ہے کہ قانون کی جہالت عذر معقول نہیں بن سکتی، جو مذکورہ بالا اصل ہی کی ایک ضروری اور اہم فرع ہے۔

قانون کا مطلب

گزشتہ آیات میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) رفع صوت، جب مجلس شوریٰ قائم ہو، مختلف مسائل ملکی و قومی پر بحث ومشاورہ ہو رہا ہو، اور اس میں صدر جمہوریہ بھی شریک ہو، تو تمام اعضاء وارکان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے رئیس کا پورا ادب ملحوظ رکھیں، جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہو تو بالکل سکوت کے ساتھ اس کے بیان کو سنیں، بلند آواز سے اس کو مخاطب نہ کریں کہ یہ سوء ادب اور نفرت وحقارت کی دلیل ہے، اور اس کے ادب واحترام کو فراموش نہ کریں، یہ قانون عام اور ہر مجلس پر حاوی ہے۔

(۲) آواز دینا، جب تم اپنے امام یا خلیفہ کو مخاطب بنانا چاہو تو اس طریق پر اس سے گفتگو نہ کرو جس طرح عام لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، بلکہ ان کا پورا احترام کیا جائے، اور کوئی بات بے ادبی اور گستاخی کی سرزد نہ ہو۔

اجر عظیم

چونکہ ان آداب ومراسم کو نظر انداز کر دینے سے تمام حکومت اسلامیہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اس لئے اگلی آیت میں ان لوگوں کو مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ دیا گیا جو ان

قوانین کی پوری پابندی کرینگے۔ بے ادبی اور گستاخی سے پیش نہ آئینگے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دل تقویٰ اللہ سے معمور ہیں، اگر ان سے نادانستہ طور پر کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی جو خلاف تہذیب ہوگی تو چونکہ ان کی نیت صالح تھی اس لئے ان سے بازپرس نہیں کی جائیگی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کی نسبت فرمایا کہ باوجود رفیع الصوت ہونے کے وہ اہل جنت میں سے ہیں۔

امام احمد نے اپنی کتاب الزہد میں حضرت مجاہد کا وہ خط نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا، : یا امیر المومنین! رجل لا یشتھی المعصیۃ ولا یعمل بھا، افضل ام رجل یشتھی المعصیۃ ولا یعمل بھا، دو آدمی ہیں، ایک تو نہ گناہ کی خواہش کرتا ہے، اور نہ اس کا ارتکاب کرتا ہے، دوسرا وہ شخص ہے جو باوجود خواہش کے اس سے بچتا ہے، ان دونوں میں سے بہترین کون ہے، آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ دوسرا شخص پہلے سے افضل ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دل خدا کے خوف کے لئے چن لئے گئے ہیں،۔

ایک اور حکم

(۴) اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ○ (۵) وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○	جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں، اور اگر وہ صبر کئے رہتے یہاں تک کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا، اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ تفصیل تو پہلے گزر چکی ہے کہ جب بنو تمیم کا وفد مدینہ میں داخل ہوا تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اپنے دولت کدہ میں تشریف رکھتے تھے، جب وفد نے آپ کو مسجد میں نہ دیکھا تو اقرع بن حابس نے کاشانۂ نبوت کے بیرون در ہی کھڑے ہوکر یا محمد یا محمد اخرج الینا کہکر پکارنا شروع کیا، یہ سخت بدتہذیبی تہی، اسلئے فرمایا کہ یہ لوگ آداب نبوت سے بالکل ناواقف ہیں، اگر ذرا صبر سے کام لیتے تو بہتر تھا، لیکن چونکہ یہ پہلی مرتبہ ہے، انہیں قوانین کی خبر نہ تہی، اس لئے اس گستاخی کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

آیندہ کے لئے اس قانون کی پابندی ہر مسلمان کو کرنی پڑیگی، کہ جب وہ اپنے خلیفہ یا رئیس جمہوریہ کی بارگاہ میں حاضر ہو تو گنواروں کی طرح آواز دیکر نہ بلائے، بلکہ مناسب طریق سے کسی جگہہ انتظار کرے، تا آنکہ وہ خود باہر آجائیں، اور اس کو شرف ملاقات بخشیں، عام لوگوں کی طرح ان کے مکان کے باہر کھڑے ہوکر ان کو آواز دینا ہرگز جائز نہیں، واب حکومت کے یہ بات بالکل خلاف ہی، اسلئے کہ اس کی عزت تمام مسلمانوں کی عزت ہی۔

فساد انگیز پراپاگنڈا

جنگ کے زمانہ میں دشمنان اسلام بعض اوقات دنیا کو مسلمانوں کی تہذیب سے بدظن کرنے، اور حقیقت میں تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے بے سروپا باتیں اڑائیں گے، اسلئے ایک قانون کلی سے اس قسم کے فسادات کو روکنے کی تمہید رکھی گئی۔ اسی ذیل میں ہمارے ملک کے ہندو مسلم منازعات ومناقشات بھی ہیں جو اجنبی ایجنسی کے ہاتھوں اس لئے عمل میں آتے ہیں کہ ان دونوں قوموں میں اتحاد نہ ہونے پائے۔

جب شیاطین الانس کفر وباطل پرستی کی نشر واشاعت کی خاطر ارباب حق وصداقت

اور تحریک حریت واستقلال کے خلاف اس قسم کا شر انگیز بر پا یا غنڈا کریں تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے، اس وقت قرآن حکیم ہماری یوں راہ نمائی کرتا ہے:

(۶) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ، (۷) وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ، (۸) فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝	مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، مبادا کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے، اور جان رکھو کہ تم میں خدا کے پیغمبر ہیں، اگر بہت سی باتوں میں وہ تمہارا کہا مان لیا کریں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا، اور اسکو تمہارے دلوں میں سجا دیا، اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا، یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں یعنی خدا کے فضل اور احسان سے، اور خدا جاننے والا حکمت والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنو مصطلق سے صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجا، زمانہ جاہلیت میں یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، جب لوگوں کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو مسلح ہو کر گاؤں سے باہر نکل آئے، اور غالباً ان کا منشا صرف استقبال تھا، مگر ہتھیار بند دیکھکر ولید کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ آمادہ جنگ و پیکار ہیں، اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ ان سے ملاقات کئے بغیر فوراً لوٹ آیا اور اپنے خیال کے مطابق دربار رسالت میں رپورٹ پیش کر دی، رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے اس شہادت کو معتبر مان کر ایک تادیبی مہم بھیجنے کا حکم فرمایا کہ اتنے میں بنو مصطلق کے ایک وفد نے حاضر ہو کر حضرت رسالت کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

راہ عمل

لہٰذا کتاب الٰہی نے اس قسم کے فسادات کا سدباب کرنے کے لئے مندرجہ ذیل قانون نوازش فرمایا کہ جب کبھی اس قسم کی کوئی خبر سننے میں آئے تو بلا اچھی طرح چھان بین کئے ہوئے فوری طیش میں آکر ہرگز کوئی راہ عمل اختیار نہ کی جائے کہ مبادا اپنے کئے پر آخرکار پشیمانی ہو، یہ ایک ایسا مفید ترین قانون ہے کہ اگر اس کو ہندوستان کے تمام لوگ اپنا اصول کار بنالیں تو ہندو مسلم مناقشات غالباً آدھے سے زیادہ بالکل معدوم ہو جائیں اور اگر یہی طرز عمل ہم اپنے تمام اسلامی ممالک کے متعلق اختیار کرلیں جن میں باہمی منافرت پھیلانے کے لئے یورپ کی خبر رساں ایجنسیاں کیا کیا نہیں کر گزرتیں تو ہمیں صدہا مصائب سے نجات مل جائے۔

عام لوگوں کو یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ ہر بات میں اپنے لیڈروں کو اس امر پر مجبور کریں کہ وہ ان کی رائے پر عمل کریں، کیونکہ ہر شخص علم سے پورا بہرہ نہیں رکھتا، سیاست سے پورا واقف نہیں ہو سکتا، اور بین الاقوامی تعلقات پر پورا عبور نہیں رکھتا، اور بسا اوقات ان سے ایسے ناشائستہ امور کا اظہار ہو جاتا ہے جو قومی وقار اور ناموس کے بخط مستقیم مخالف ہوتے ہیں، اب اگر ہر امر میں ان کی تقلید کی جائے تو کوئی نظام ہی باقی نہ رہ سکیگا، اور لیڈروں کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔

فریضۂ اصلاح

(۹) وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ | اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں

اقْتَتَلُوا فَاَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○	لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو، اور اگر ایک فریق دوسر پر زیادتی کرے، تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائیں، پس جب وہ رجوع لائیں تو دونوں فریقوں میں مساوات کے ساتھ صلح کرادو، اور انصاف سے کام لو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

گزشتہ آیات میں یہ حکم تھا کہ محض افواہ کو ایک حقیقت نفس الامری تسلیم کرکے کوئی فیصلہ نہ کرلو، لوگ تو اسے ایک معمولی بات خیال کرکے شہرت دے دیتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ اس کا اثر کس قدر دوررس ہوگا: تحسبونه هينا وهو عند الله العظيم (۲۴: ۱۵) تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے ہو، اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات ہے، اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر واقعہ میں یہ اطلاع صحیح ہو کہ مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑے ہیں تو مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ فوراً اس کے انسداد کی طرف متوجہ ہو جائیں، اور اپنے پورے اثر اور دباؤ سے کام لیکر اس فتنہ کی آگ کو فرو کردیں حقیقت یہ ہے کہ دنیائے اسلام پر جس قدر مصائب نازل ہوئے، ان کی ابتدا بالکل معمولی واقعات سے ہوئی، مگر اس وقت کے ارباب حل و عقد نے بوجہ عدم بصیرت تامہ ان کو حقیر خیال کرکے نظر انداز کردیا، اور پھر جو کچھ ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے۔

لیکن اگر باوجود پوری کوشش کے ایک جماعت اصلاح پر راضی نہ ہو تو حکومت اپنی فوجی طاقت سے دوسرے گروہ کی امداد کرکے اس کو صلح کے لئے مجبور کردے، البتہ جب

دونوں فریق اس پر رضامند ہوجائیں تو ایک کمیشن ہر ایک گروہ کے بیانات و مطالبات کو سنے، اور عدل و انصاف سے فیصلہ صادر کردے، مسلم میں ہے: المقسطون عند اللہ یوم القیٰمۃ علیٰ منابر من نور علیٰ یمین العرش یعدلون فی حکمھم، جو لوگ تمام منازعات کے طے کرنے میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں وہ قیامت کے روز عرش کے دائیں جانب نور کے ممبروں پر ہونگے۔

بخاری میں ہے کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے چلیں، شاید وہ راہ راست پر آجائے، آپ جو وہاں گئے تو اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا: الیك عنی فواللہ لقد اذانی ریح حمارك دور ہوجائیے مجھے آپ کے گدھے کی بو نے سخت تکلیف میں ڈال دیا ہے، ایک انصاری نے سنا تو غصہ میں آکر کہنے لگا: واللہ لحمار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطیب ریحا منك، خدا کی قسم رسول اللہ کا گدھا تجھ سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اب کیا تھا، دونوں فریقوں میں جنگ شروع ہوگئی مگر آپ نے صلح کرادی، الصلح خیر۔

آپ نے ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ایک تعریف یہ بھی کی کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کے دو عظیم الشان گروہوں میں صلح ہوجائیگی، بخاری میں آتا ہے: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطب یوما، ومعہ علی المنبر الحسن بن علی، فجعل ینظر الیہ مرۃ، والی الناس اخریٰ، ویقول ان ابنی ھذا سید، ولعل اللہ تعالیٰ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین، ایک مرتبہ رسول اللہ خطبہ دے رہے تھے اور حسن بن علی بھی ممبر پر بیٹھے ہوئے تھے پس کبھی تو آپ لوگوں کی طرف دیکھتے، اور کبھی حسن کی طرف نظر کرتے، اور فرماتے کہ میرا یہ بیٹا سید ہے، اور

عجب نہیں کہ اللہ مسلمانوں کے دو عظیم الشان گروہوں میں اس کی وجہ سے صلح کرا دے۔
ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: انصر اخاک ظالما او مظلوما، اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، انس بن مالک نے عرض کیا: هذا نصرته مظلوما فکیف انصره ظالما قال صلی اللہ علیہ وسلم تمنعه من الظلم فذاك نصرك ایاه۔ خیر مظلوم کی مدد تو میں نے کر دی، مگر ظالم کی اعانت کیسے کرونگا، آپ نے فرمایا، اس کو ظلم سے روکنا ہی اس کی مدد ہے۔

اسلامی برادری

(۱۰) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو، اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

مختلف چیزیں باہمی تعلقات کا سبب بن سکتی ہیں، مگر ان کی حالت یہ ہے کہ ان میں قیام وثبات نہیں، قرآن حکیم نے نہ تو وطنیت کو ذریعہ اتحاد قرار دیا ہے، اور نہ قومیت کو اس نے ان سب سے بالاتر اور وسیع تر حلقہ اخوت اسلام کا قائم کیا، مہاجرین وانصار کو بھائی بنا کر اسود و ابیض کی تفریق کو مٹا دیا، اور شاہ و گدا کو، آقا و غلام کو، اور حاکم و محکوم کو ایک دوسرے کے دوش بدوش کھڑا کر کے بتا دیا کہ عزت صرف تقوی اور طہارت کی بنا پر ہے۔

اس عالمگیر برادری کو مضبوط و قوی تر بنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اخوالمسلم لا یظلمه ولا یسلمه، ایک مسلمان نہ تو اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کرتا ہے، اور نہ اسے دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ بھی فرمایا: واللہ فی

عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ، اللہ ہی اس شخص کی مدد کرتا ہے جو اپنے بھائی کی طرف دست اعانت دراز کرتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے: اذا دعا المسلم لاخیہ بظہر الغیب قال الملك امین ولك مثلہ، جب ایک مسلمان اپنے بھائی کی غیبت میں اس کے لئے دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے آمین، اور تجھے بھی نصیب ہو، دوسری حدیث میں ہے: المومنون فی توادھم وتراحمہم وتواصلہم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالحمی والسھر اس طرح بھی ہے: المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا، مسند امام احمد میں ہے: ان المومن لاھل الایمان بمنزلۃ الراس من الجسد، یالم المومن لاھل الایمان کما یالم الجسد لما فی الراس۔

جب دنیا بھر کے مسلمانوں کے تعلقات و روابط ایسے ہوں جو اوپر کی احادیث میں بیان کئے گئے ہیں تو ان میں کسی طرح بھی جنگ نہیں ہوسکتی، لیکن اگر خدانخواستہ کبھی کوئی ایسی صورت پیش آجائے تو سب کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرانے کی کوشش کریں، ایسا نہ ہو کہ ان کے مناقشات دوسروں کو ان پر حملہ کرنے کا موقع دیں۔

دنیا کے تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں، اور اس تعلق کو آب وہوا، اور رنگت و نسل کے امتیازات بالکل نہیں توڑ سکتے، جب قرآن نے یہ قانون اصول موضوعہ کے طور پر ہمارے سامنے رکھ دیا تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ ملّی اور ملکی حقوق میں ان سب کو مساوات حاصل ہے، اور ذرّہ برابر تفریق عمل میں نہ لائی جائیگی۔

فصل ثانی

انسداد شر

قرآن حکیم کی تعلیمات کا اصلی منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک ایسی مہذب اور شائستہ قوم بنا دیا جائے جس کی سیرت اور کیرکٹر کو تمام دنیا قابل تقلید سمجھے، ہر ایک مسلمان میں اس قدر احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور مسئول انسان خیال کرے، اور یہ یقین کر لے کہ میری زندگی دوسروں کے لئے نمونہ ہے، اس لئے مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونی چاہیئے جو شرافت اسلام کے شایاں نہ ہو۔

گزشتہ آیات کا مفہوم یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کی کسی آبادی میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو ان لوگوں کا فرض ہے کہ اپنا اثر ڈال کر اس فتنہ کو فرو کر دیں، اور لڑنے والوں میں صلح کرا دیں، اب یہ سمجھایا جاتا ہے کہ ان تمام منازعات کا سد باب کیونکر ہو:

امتناعی احکام

(۱۱) يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ ٱلِٱسْمُ	مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں، ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں، اور اپنے مومن بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو، ایمان کے بعد برا نام رکھنا گناہ ہے، اور جو توبہ نہ کریں وہ

الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ۝ | ظالم ہیں۔

جو لوگ جمع مال و دولت کو اپنا مقصد حیات بنا لیتے ہیں، ان کی تمام تر زندگی عیش و آرام میں ضائع ہو جاتی ہے، کوئی مفید کام ان سے عمل میں نہیں آتا، بیکاری کے اشغال میں سے ایک یہ عیب بھی ان میں پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ہر وقت دوسروں کے عیوب کی تلاش و جستجو میں رہتے ہیں، اور ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں، آج کل کی مہذب اور شائستہ جماعتوں کو اگر تم دیکھو تو ان میں یہ مرض کثرت سے ملیگا، لہذا قرآن حکیم نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ حسب ذیل خرابیوں سے بچیں۔

(الف) تمسخر، یہ مرض اس شخص میں پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر خیال کرتا ہے، وہ اس غرور و تکبر کی بنا پر اپنا یہ حق طبعی سمجھتا ہے کہ اپنے سے کمتر درجہ والے شخص کے ساتھ تمسخر و استہزا کرے، یہ مرض ابتدا میں تو معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اس کا بدترین اثر بہت دور تک پہنچتا ہے، اسلئے کہ ہر ایک انسان میں عزت نفس کا احساس موجود ہے، ایک مدت تک وہ اس ذلت اور حقارت کو برداشت کر سکتا ہے، آخر اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو کر اس میں جذبہ انتقام کو بھڑکائیگا، اور انجام کار جنگ تک نوبت پہنچیگی، یہ بیماری دولتمندوں میں عموماً اور بعض اوقات اہل علم میں بھی ہوتی ہے۔ کہ وہ دوسروں کو اپنے سے حقیر خیال کرتے ہیں، حدیث میں اس مرض کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے: بطر الحق وغمط الناس، حق کو ٹھکرانا، اور لوگوں کو حقیر و ذلیل خیال کرنا۔

یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی نسبت دعوی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا، کہ وہ دوسرے لوگوں کی نسبت اچھا ہے، ممکن ہے کہ جن بندگان خدا کو ہم اپنے سے حقیر خیال کرتے ہوں،

خدا کی نظر میں وہی ہم سے بہتر اور لو اقسم علی اللہ لابرہ میں داخل ہوں، اس لئے ہر ایک مسلمان کے لئے اسلم و احوط یہی ہے کہ وہ اس دنارت سے مجتنب رہے۔

یہ مرض نہ صرف مردوں میں ہوتا ہے بلکہ عورتیں اس کا کہیں زیادہ شکار ہوتی ہیں اس لئے دونوں کو تنبیہ کی گئی کہ حقیقی اصلاح گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتی ہے۔

(ب) عیب چینی، لمز کہتے ہیں: ذکر ما فی الرجل من العیب فی غیبتہ، ایک شخص کے عیوب کو اس کی غیبت میں ذکر کرنا، یہ مرض بھی دوسرے کو حقیر سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے، قرآن حکیم نے کفار کی بری عادتیں ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ھماز مشاء بنمیم، سورۂ ہمزہ میں آتا ہے: ویل لکل ھمزۃ لمزہ، بخاری نے ابن عباس سے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں: لا یطعن بعضکم علی بعض، ایک دوسرے پر طعن نہ کرے، مجاہد، قتادہ، اور سعید بن جبیر کی بھی یہی رائے ہے، ضحاک کہتے ہیں: لا یلعن بعضکم بعضا۔ ایک دوسرے پر لعنت نہ بھیجے۔

(ج) برا نام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت مدینہ منورہ میں یہ مرض عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ ایک شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے، قبیلہ بنو سلمہ کی یہ کیفیت تھی: لیس فینا رجل الا ولہ اسمان او ثلاثۃ، فکان اذا دعی احدھم باسم من تلک الاسماء، قالوا یا رسول اللہ انہ یکرہ ھذا الاسم، ہم میں سے کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کے دو دو تین تین نام نہ رکھے گئے ہوں، جب ان میں سے کسی نام کے ساتھ وہ پکارا جاتا تو ہم عرض کرتے کہ اس نام کو وہ برا سمجھتا ہے۔ اس پر یہ ممانعت نازل ہوئی، ابن عباس اس آیت کے یہ معنی بیان کرتے ہیں: ان یکون الرجل عمل السیأت ثم تاب منھا و راجع الحق فنھی اللہ ان یعیر بما سلف من عملہ

ایک شخص نے گناہ کئے تھے بعد کو توبہ کرلی تھی، اب خدا نے منع کردیا کہ اس کے گزشتہ گناہ یاد دلاکر اس کو شرمندہ مت کرو، ابن مسعود کی رائے ہے: ان یقول اذا کان الرجل یھودیا فاسلم یا یھودی، یا نصرانی، یا مجوسی، ویقول للرجل المسلم یا فاسق، عطا کہتے ہیں: ان یسمیه بغیر اسم الاسلام یا خنزیر، یا کلب، اسلامی نام کے سوا اسے خنزیر یا کتا کہکر پکارنا، مجاہد کہتے ہیں: یدعی الرجل بالکفر و هو مسلم، حسن فرماتے ہیں: ان یقول الرجل لاخیه یا فاسق۔ ایک شخص اپنے بھائی کو فاسق کہکر پکارے۔

ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ جب ایک شخص مسلمان ہوگیا تو پھر اسے کسی برے نام سے یاد نہیں کرنا چاہیئے، یہ افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آج مسلمانوں کی ہر سوسائٹی ان امراض میں مبتلا ہے۔

(۱۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ

اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو، کہ بعض گمان گناہ ہیں، اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو، اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تو تم ضرور نفرت کروگے، تو غیبت نہ کرو، اور خدا کا ڈر رکھو، بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں تین اور بداخلاقیوں سے روکا گیا ہے جن کی وجہ سے تمام فردی

قوم برباد ہو جاتی ہے :

سوءالظن

بعض اوقات ہم کسی مسلمان کو ایک کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں، یا اسکے متعلق کوئی افواہ سن پاتے ہیں، تو فوراً اس کی نسبت ہمارے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر بتدریج اس کی طرف فسق اور عصیان منسوب کر دیتے ہیں، یہ بھی تمدن اور تہذیب کے امراض میں سے ایک بیماری ہے، جو تمام قوم کا ستیاناس کر دیتی ہے، اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے اس کی ممانعت کی، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے، دوران طواف میں آپ نے اس گھر کو مخاطب کرکے فرمایا: ما اطیبك واطیب ریحك، ما اعظمك واعظم حرمتك، والذی نفس محمد بیدہ لحرمۃ المومن اعظم عند اللہ حرمۃ منك مالہ ودمہ، وان یظن بہ خیرا، بخاری میں ہے: ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث، ولا تجسسوا ولا تنافسوا، ولا تحاسدوا، ولا تباغضوا، ولا تدابروا، وکونوا عباد اللہ اخوانا، سوءظن سے پرہیز کرو اس لئے کہ بدظنی اکذب الحدیث ہے، اور تجسس، تنافس، تحاسد اور باہمی بغض و عداوت سے بچ کر اللہ کے بندے آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ طبرانی میں ہے: ثلاث لازمات لامتی الطیرۃ والحسد وسوء الظن، فقال رجل وما یذھبھن یا رسول اللہ ممن ھن فیہ، قال صلی اللہ علیہ وسلم اذا حسدت فاستغفر اللہ، واذا ظننت فلا تحقق، واذا تطیرت فامض، میری اُمت میں تین عیوب ضرور ہونگے، بدفالی، حسد اور سوءالظن، اور اسکے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ اگر حسد کا مرض پیدا ہو تو استغفار کرو، ظن و گمان کی وجہ سے تحقیق میں نہ پڑجاؤ، اور بدفالی کے باوجود

اپنا کام کئے جاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ولا تظنن بکلمۃ خرجت من اخیک المومن الا خیرا وانت تجد لھا من الخیر محملا۔ تیرے مسلمان بھائی کے منہ سے اگر کوئی بات نکلے، اور اس کا اچھا محمل مل سکتا ہے تو اس کو اسی پر محمل کرو، اور اس سے سوء الظن نہ کرو۔

جاسوسی

تجسس کہتے ہیں: البحث عما ینکتم عنک من عیوب المسلمین وعوراتھم، مسلمانوں کے عیوب کی ٹوہ میں رہنا، ایک شخص اپنے مکان میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ایک کام کرتا ہے، اب کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کی شخصی آزادی کو سلب کرے، فرزندان اسلام اپنی مجالس میں حریت واستقلال کے کسب وحصول، اور قرآن حکیم کی نشر واشاعت کی تجاویز پر غور کرتے ہیں، مگر بعض بدباطن ان امور کو دشمنان دین و ملت کے پاس پہنچا کر اسلام کی ترقی کو روک دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سورۂ ممتحنہ میں اس جرم عظیم کے مرتکب کو کافر اور خارج عن الملت قرار دیا گیا ہے: ومن یفعلہ منکم فقد ضل سواء السبیل، اور تم میں سے جو شخص اس جرم کا ارتکاب کریگا وہ صراط مستقیم سے دور ہو جائے گا۔

احادیث وآثار میں اس پر سخت زجر و توبیخ کی گئی ہے، نسائی میں ہے کہ رسول اللہ نے حضرت معاویہ کو یہ نصیحت کی: انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم اوکدت تفسدھم، اگر تم نے لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگائی تو تم ان سب کو خراب کردوگے ابو درداء کہتے ہیں کہ ان الفاظ نے معاویہ کو بے انتہا فائدہ پہنچایا، ابو داؤد میں ہے: ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم، جب امیر اپنی رعایا کو شک کی

نگاہ سے دیکھنا شروع کردیگا، تو اس نے گویا ان کو برباد کردیا - ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے دوران خطبہ میں فرمایا: یامعشر من امن بلسانہ ولم یدخل الایمان فی قلبہ لاتتبعوا عورات المسلمین، فانہ من اتبع عورات المسلمین فضحہ اللہ فی قعر بیتہ۔ اے وہ لوگ جو صرف زبان سے اسلام قبول کرچکے ہو، اور تمہارے دل ایمان سے خالی ہیں، مسلمانوں کے عیوب کی تلاش نہ کرو، اس لئے کہ جو ایسا کریگا، اللہ اسکو اس کے گھر کے اندر ہی ذلیل کردیگا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاسوسی کی دناءت وہی لوگ برداشت کرتے ہیں جو صرف زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہوں، اور انکے دل ویسے ہی سیاہ اور تاریک ہوں -

ابو داؤد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں ایک شخص پیش کیا گیا جس کی نسبت لوگوں نے بیان کیا کہ اس کی ڈاڑھی سے شراب کے قطرے گرتے ہیں، آپ نے فرمایا: اناقد نھینا عن التجسس، ولکن ان یظہر لنا شی نلخذ بہ، ہمیں تجسس سے روکا گیا ہے، لیکن اگر کوئی بات ہم پر ظاہر ہوجائے، تو اس پر ضرور مواخذہ کرینگے، ایک مرتبہ عمر اور عبدالرحمن بن عوف شب کے وقت شہر کی پاسبانی کررہے تھے کہ ایک مکان میں چراغ روشن دکھائی دیا، دونوں اس کی طرف چلے، خلیفہ نے کہا، یہ ربیعہ بن امیۃ بن خلف ہے، اور وہ اس وقت شراب میں مخمور ہوگا، مشورہ ہو تو اس کے گھر میں گھس جائیں، عبدالرحمن نے جواب دیا: قد اتینا ما نھی اللہ عنہ قال اللہ ولا تجسسوا فقد تجسسنا، اگر ہم نے ایسا کیا تو گویا جاسوسی کے مرتکب ہوئے، حالانکہ اللہ نے اس سے روکا ہے - حضرت عمر یہ سن کر آگے بڑھ گئے اور اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیا، ابن عباس فرماتے ہیں: نھی اللہ المومن ان یتبع عورات اخیہ المومن،

اپنے مسلمان بھائی کے چھپے ہوئے عیوب کی تلاش سے اللہ نے منع کیا ہے، مجاہد کا قول ہے: خذوا ما ظهر ودعوا ما ستره الله، جوظاہر ہو اس کو لو، اور اس کو چھوڑ دو جس پر خدا نے پردہ پوشی کی ہے۔

حضرت عمر ایک رات گشت لگا رہے تھے کہ ایک مکان میں سے گانے کی آواز آئی، یہ پشت کی طرف سے اس گھر میں گھس گئے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت بھی موجود ہے، اور شراب کا دور چل رہا ہے، حضرت عمر نے کہا: یا عدو الله ان الله یسترك وانت على معصية، اے خدا کے دشمن خدا نے تیری پردہ پوشی کی ہے اور تو معصیت کا ارتکاب کر رہا ہے، اس نے کہا، امیر المومنین آپ جلدی نہ کیجئے، میں نے اگر ایک بات میں خدا کی نافرمانی کی ہے تو آپ تین جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں: قال الله تعالیٰ ولا تجسسوا وقد تجسست، وقال واتوا البیوت من ابوابها وقد تسورت علیّ، ودخلت علی بغیر اذن، وقال الله لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علیٰ اهلها، خدا نے تجسس سے روکا ہے، اور آپ نے وہی کیا، خدا کہتا ہے کہ گھروں میں دروازہ سے داخل ہو، اور آپ پشت کی طرف سے داخل ہوئے، اور آپ بغیر اذن و سلام کے میرے پاس آگئے، حالانکہ خدا کا حکم یہ ہے کہ اجازت لیکر اور سلام کہکر داخل ہو۔ یہ سن کر انہوں نے کہا: فهل عندك من خير ان عفوت عنه، قال نعم فعفا عنه، اگر میں معاف کردوں تو پھر تو نیک بن جاؤ گے، اس نے اقرار کیا تو آپ نے اس کو بخش دیا۔

کتاب و سنت کی ان تصریحات کے بعد اندازہ کیجئے ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کی تمامتر زندگی اس جرم و معصیت میں صرف ہوتی ہے، اور جن کا شب و روز کام ہی یہی ہے کہ وہ نہ صرف عام مسلمانوں کے مستور و محجوب اعمال کی ٹوہ لگاتے پھریں، بلکہ اسلامی

حکومتوں کے برباد کرنے اور مسلمانوں کو غیروں کا غلام بنانے میں ان کی زندگیاں معین ہو جائیں۔

غیبت

یہ تیسری معصیت ہے جو سوسائٹی کو گندا اور ناپاک کر دیتی ہے، ابوداؤد میں ابوہریرہؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبت کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: ذکرك اخاك بما یکرہ، اپنے بھائی کا اس طرح ذکر کرنا کہ اگر وہ سنتا تو وہ اس کو برا خیال کرتا، تو سائل نے پوچھا: افرایت ان کان فی اخی ما اقول، اگر میں وہی بیان کروں جو عیب اس میں ہے، تو آپ نے فرمایا: ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ، وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتہ، اگر تم نے وہ عیب بیان کیا جو اس میں ہے تو یہ غیبت ہے، اور اگر ایسا نہیں تو تو نے اس پر بہتان باندھا۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک قصیر القامت عورت آئی، جب چلنے کے لئے کھڑی ہوئی تو عائشہؓ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے رسول اللہ کو یہ بتانا چاہا کہ اس کا قد کس قدر چھوٹا ہے تو آپ نے فرمایا: اغتبیتھا، تو نے اس کی غیبت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا۔

حجۃ الوداع کے روز آپ نے جو شہرہ آفاق خطبہ دیا، اس کے یہ الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں: ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا، جس طرح آج کا دن، یہ مہینہ، اور یہ شہر تمہارے نزدیک قابل احترام ہے، اسی طرح تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر حرام ہے، ابوداؤد میں ہے: کل المسلم علی المسلم حرام مالہ وعرضہ ودمہٗ

حسب امرئ من الشر ان یحقر اخاہ المسلم، ایک مسلمان پر اپنے بھائی کی ہر چیز حرام ہے، اس کا مال اس کی عزت، اور اس کا خون، شر میں سے اتنا ہی بہت کافی ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کو حقیر خیال کرے، ایک اور روایت میں آپ فرماتے ہیں: لما عرج بی مررت بقوم لھم اظفار من نحاس یخمشون وجوھھم وصدورھم، قلت من ھؤلاء یا جبریل، قال ھؤلاء الذین یاکلون لحوم الناس ویقعون فی اعراضھم، جب میں معراج میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک جماعت اپنے چہروں کو پیتل کے ناخنوں سے نوچ رہی ہے، میں نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو انہوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو غیبت کرتے تھے، اور لوگوں کی آبرو برباد کرتے تھے۔ مسند امام احمد میں جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ کے ساتھ تھے کہ کہیں سے سخت بو آئی، آپ نے پوچھا کہ جانتے ہو یہ کیا چیز ہے، پھر خود ہی فرمایا: ھذہ الریح الذین یغتابون الناس، جو لوگ دوسروں کی غیبت کرتے ہیں یہ ان کی بدبو دار ہوا ہے۔

انتخاب کی خرابیاں

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام مسلمانوں کو برابر کے حقوق دیے جائیں گے، تو اس سے یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ انتخاب عامہ میں مجلس شوریٰ کی رکنیت کیلئے ہر ایک مسلمان کو کھڑے ہونے کا حق حاصل ہوگا، البتہ جو شخص بھی انتخاب کے لئے کھڑا ہو، اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ ان تمام عیوب سے بچنے کی کوشش کرے، جو سعی انتخاب میں رونما ہوتے ہیں، اور جن کا تذکرہ ان دو آیات میں کیا گیا ہے۔

اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنے گرد و پیش نظر ڈورائیں، اور دیکھیں کہ ایک امیدوار اپنے آپ کو کامیاب بنانے کے لئے کس قدر اخلاق اور تہذیب سے گری ہوئی باتوں کا

ارتکاب کرتا ہے، اور کس طرح اپنے حریف کو گرانے کے واسطے اسکے عیوب و معاصی کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے تو آپ پر یہ واضح ہوجائیگا کہ ان آیات نے ان تمام جرائم کا سد باب کردیا ہے، مسلمانوں کی سوسائٹی ان بداعمالیوں میں مبتلا نہیں ہوسکتی، اور اگر کوئی امیدوار ایسا کرتا ہوا پایا جائیگا تو حکومت اس کو ناقابل انتخاب قرار دے دیگی۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس وقت تمام مہذب دنیا ان امراض میں مبتلا ہے، اور ہمیشہ انتخاب کے موقع پر ان نقائص سے ہر ایک شخص کم وبیش ملوث ہوجاتا ہے، اسلام نے یہ ایک جدید اصول پیش کیا ہے، کیا دنیا کے پاس اس سے بہتر بھی قانون ہے۔

مساوات عمومی

(۱۳) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ہ	لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، اور خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، بیشک خدا سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے۔

گزشتہ امراض اس وقت کسی شخص میں پیدا ہوتے ہیں جب وہ اپنے بھائی کو حقیر خیال کرنے لگتا ہے، اس آیت نے بتادیا کہ سب کے سب ایک ماں اور باپ کی اولاد ہیں پھر فخر و غرور کس لئے، یہ نسب جس پر انسان اس قدر اتراتا ہے وہ تو صرف اس لئے ہے کہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکیں، سورۂ نسا کی ابتدا ہی اسی مضمون سے کی گئی ہے:

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا

وبث منہما رجالا کثیرا ونساء، پس شعوب وقبائل کے اختلاف کی وجہ سے نوع انسانی کو ایک دوسرے سے اجنبی ہونے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ اور زیادہ قرب و اتصال کی ضرورت ہے۔

انسان اگر بہ اقرآن پر ممتاز ہوتا ہے تو وہ صرف حسن خلق اور تقوی اللہ ہے، مگر اسکی یہ حالت ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی شخص اس کی حقیقت سے پورے طور پر آگاہ نہیں ہو سکتا، پس جب واقعہ یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک انسان کو کبھی بھی دوسرے انسان پر تکبر نہ کرنا چاہیئے۔

دنیا میں سب سے پہلے جس ذات اقدس نے عام انسانی برادری کا اعلان کیا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے، بخاری میں ہے کہ آپ سے اکرم الناس کی بابت دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اکرمهم عند الله اتقاهم، قالوا ليس عن هذا نسئلك، قال فاكرم الناس يوسف نبي الله بن نبي الله بن نبي الله بن خليل الله، قالوا ليس عن هذا نسئلك، قال فعن معادن العرب تسالونی، قالوا نعم، قال فخیارکم فی الجاهلية خيارکم فی الاسلام اذا فقهوا، مسلم میں ہے: ان الله لا ينظر الى صوركم واموالكم ولكن ينظر الى قلوبكم واعمالكم، اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر قلوب واعمال پر ہوتی ہے۔ مسند امام احمد میں ہے کہ آپ نے ابوذر غفاری سے فرمایا: انظر انك لست بخير من احمر ولا اسود الا ان تفضله بتقوى الله، دیکھو تم کسی سرخ اور سفید رنگ والے سے تقوی کے سوا بلند مرتبہ نہیں ہو۔ ایک مرتبہ آپ نے کہا: کلکم بنو آدم وآدم خلق من تراب ولینتهین قوم يفخرون بآبائهم اوليكونن اهون على الله تعالى من الجعلان،

حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: لوگو اللہ نے اجداد پر فخر کرنا مٹا دیا، اب صرف دو ہی قسم کے آدمی ہیں، نیک متقی، اللہ کے نزدیک معزز، اور دوسرا بداخلاق، بدبخت جسکی اللہ کے نزدیک کوئی عزت نہیں، یا یہا الناس ان اللہ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ وتعظمھا باباءھا، فالناس رجلان، رجل برتقی کریم علی اللہ تعالیٰ و رجل فاجر شقی ھین علی اللہ، اس کے بعد آپ نے وہی آیت تلاوت کی جو زیب عنوان ہے، مسند امام احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے بہترین آدمی کے متعلق سوال کیا، تو آپ نے فرمایا: خیر الناس اقراھم واتقاھم للہ عزوجل و امرھم بالمعروف وانھاھم عن المنکر، بہترین شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ عالم، متقی، مبلغ و داعی حق ہو، حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ما اعجب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شی من الدنیا ولا اعجب احد قط الا ذوتقی، دنیا میں سے رسول اللہ کو صرف وہ شخص پسند آتا تھا جو متقی ہو۔

جس نسب پر آج ہم غرور کر رہے ہیں، کل اس کی کیفیت یہ ہوگی: یوم یفر المرء من اخیہ، وامہ وابیہ، وصاحبتہ وبنیہ، لکل امری منہم یومئذ شان یغنیہ، (۸۰: ۳۴ تا ۳۷) اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگیگا، اور اپنی ماں، اور اپنے باپ سے، اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے، ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا جو اسے مصروفیت کے لئے بس کریگا۔ دوسری جگہ آتا ہے: لا تنفعکم ارحامکم و اولادکم یوم القیٰمۃ، وہاں قدر اگر ہے تو اس کی جو قلب سلیم لیکر آئے، اور نسب صرف دنیوی چیز ہے، اس کو فضیلت و برتری انسان سے کوئی تعلق نہیں، اور اسی لئے قیامت کے روز اس سلسلہ نسب کو محو و باطل کر دیا جائیگا، اور اس کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا

کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور نہ وہ لوگ خود آپس میں ایک دوسرے کا نسب کی وجہ سے خیال کرینگے، بلکہ صرف اعمال صالحہ ہی نجات کا باعث بن سکینگے، سورۂ مومنون میں آتا ہے: فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینہم ولا یتساء لون، (۲۳: ۱۰۱) پھر جب صور پھونکا جائیگا، تو نہ تو ان میں قرابتیں رہینگی، اور نہ ایک دوسرے کو پوچھینگے،

مزید تشریح

(۱۴) قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، اور ایمان تو ہنوز تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا، اور اگر تم خدا اور اسکے رسول کی فرمانبرداری کروگے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریگا، بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس اصول کی مزید توضیح کی جاتی ہے کہ عرب کے بہت سے قبائل جو حدیث العہد بالاسلام تھے، اور حلاوت ایمان سے ان کے قلوب ہنوز محروم تھے، ان کی نسبت ارشاد ہوا کہ تم اس وقت صرف ابتدائی درجہ میں داخل ہوئے ہو، ابھی پکے مسلمان نہیں ہوئے۔

اس آیت میں یہ بتادیا کہ اسلام صرف ظاہری پابندی پر اطلاق کیا جاسکتا ہے، اگر یہ درجہ کافی نہیں جب تک قلوب ایمان سے منور نہ ہوں۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جو دین میں تازہ داخل ہوئے ہوں، انہیں اس وقت تک حق انتخاب نہ دیا جائے، جب تک کہ ظاہری آثار و قرائن سے یہ بات معلوم نہ ہوجائے کہ ایمان ان کے دلوں میں داخل ہوگیا ہے، اسی لئے اگلی آیت میں ارباب ایمان کی خصوصیات بیان کگئیں،

حقیقت ایمان

(۱۵) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ، (۱۶) قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ؀	مومن تو وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے، اور خدا کی راہ میں مال اور جان سے لڑے، یہی لوگ ایمان کے سچے ہیں، ان سے کہو کیا تم خدا کو اپنی دینداری جتاتے ہو، اور خدا تو آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں سے واقف ہے، اور خدا ہر شے کو جانتا ہے۔

اسلام تو محض زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے، اصل ایمان یہ ہے کہ پھر اسکی صداقت میں ایک لمحہ کے لئے بھی شک و شبہ نہ ہو، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: لوکشفت الحجاب ما ازددت یقینا، اگر یہ پردے بھی میرے سامنے سے اٹھ جائیں تو میرے یقین میں زیادتی نہ ہوگی۔ حدیث جبرئیل میں کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك اسی کی اعلیٰ ترین منزل ہے، جب یہ کیفیت ایمانیہ اس پر طاری ہوگی، تو وہ اپنی جان، اپنا مال، غرض یہ کہ سب کچھ ایک ہی محبوب حقیقی کے نام پر قربان کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہیگا، اسی کی صدا بلند کرنا، اور اس کو دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہنچانا اس کا مقصد حیات بن جائیگا، بس یہ لوگ ایمان اور صداقت کا دعوی کر سکتے ہیں۔

مسند امام احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الاسلام علانیۃ والایمان فی القلب ثم یشیر بیدہ الی صدرہ ثلاث مرات ویقول، التقوی ھھنا، التقوی ھھنا، اسلام ظاہر اور ایمان دل میں، پھر آپ نے سینہ کی طرف اشارہ

تین مرتبہ اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ اس جگہہ ہے۔ اسی میں ہے کہ آپ نے ارباب ایمان کو تین حصوں پر تقسیم کیا ہے: الذین آمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسہم فی سبیل اللہ، والذی یامنہ الناس علیٰ اموالھم وانفسہم والذی اذا اشرف علی طمع یذکر اللہ عزوجل، ایک وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہیں کیا، اور اپنی جان ومال کو اس کی راہ میں لٹا دیا، دوسرے وہ ہیں کہ لوگوں کے مال اور ان کی جانیں ان سے امن میں ہیں، اور تیسرا وہ شخص ہے کہ جب اس پر طمع غالب آنے لگتی ہے تو فوراً اللہ کو یاد کر لیتا ہے۔

ہر شخص کے تقویٰ اور طہارت کو صرف اللہ ہی جانتا ہے، اسے بتانے کی ضرورت نہیں، وہ عالم السرائر والخفایا ہے، انسان کا کام یہ ہے کہ وہ تقویٰ اللہ کو اپنا شعار بنائے، اور کبھی یہ خیال نہ کرے کہ اس نے اپنے مقصد کو پالیا اسلئے کہ ارتقائے انسانی کی کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی، پھر ہم کیوں ایک جگہہ جا کر رک جائیں، بلکہ واجعلنا للمتقین اماما کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونے کی دعا کریں۔

اللہ کا احسان

(۱۷) يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۖ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ، (۱۸) إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوگئے ہیں، کہدو کہ اپنے مسلمان ہونیکا مجھ پر احسان نہ رکھو، بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا رستہ دکھایا، بشرطیکہ تم سچے مسلمان ہو، بیشک خدا آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھتا ہے۔

نسائی میں ہے کہ قبیلہ بنو اسد کے لوگ دربار رسالت میں حاضر ہو کر احسان کے طور پر کہنے لگے۔ اسلمنا وقاتلك العرب ولم نقاتلك، ہم نے اسلام قبول کیا، قبائل عرب نے آپ سے جنگ کی مگر ہم اس سے محترز رہے، گویا یہ لوگ اسلام لا کر ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے آپ پر بڑا احسان کیا، حالانکہ ایسا کہنا ہی یکسر غلط ہے، بلکہ خود ان پر یہ خدا کا فضل و احسان ہے کہ وہ انہیں راہ حق دکھاتا ہے، ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ حنین میں انصار کو مخاطب کر کے فرمایا: الم اجدکم ضلالا فھداکم اللہ بی، وکنتم متفرقین فالفکم اللہ بی، وکنتم عالۃ فاغنکم اللہ بی، کیا میں نے تمہیں گمراہ نہ پایا پھر میری وساطت سے خدا نے تمہیں ہدایت دی، تم الگ الگ تھے، میرے ذریعہ سے خدا نے تم میں اتحاد پیدا کیا، اور تم مفلس تھے، میری وجہ سے خدا نے تمہیں دولتمند کر دیا۔ وہ لوگ ہر ایک سوال کے جواب میں عرض کرتے تھے: اللہ ورسولہ امن، بیشک اللہ اور اسکے رسول نے ہم پر سب سے زیادہ احسان کیا ہے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ ذراسی خدمت بھی ملک اور قوم کی کرتے ہیں تو ہر کوچہ و بازار میں اسکا اعلان کرتے پھرتے ہیں اور مسلمانوں کے رہنماؤں، لیڈروں اور عام لوگوں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس خدمت کی وجہ سے انہوں نے دنیائے اسلام پر عظیم الشان احسان کیا ہے، اور آج کل خصوصًا یہ مرض بہت پھیلا ہوا ہے، ان لوگوں کو تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس نے انہیں خدمت ملّت کی توفیق بخشی، اور ہدایت و سعادت کی طرف انکی راہ نمائی کی۔

اس قسم کا اشتہار و اعلان تو ان مسلمانوں کے درجہ سے گری ہوئی بات ہے، اللہ تو غیب السموٰت والارض سے واقف ہے، وہ ان اعمال کے ان اثرات و نتائج کو بھی جانتا ہے جو ان کے قلوب اور اخلاق میں پیدا ہونگے، پس جب حالت یہ ہے تو ہر ایک انسان کا فرض یہی ہے کہ ظاہر کئے بغیر ملک و ملت کی خدمت میں مصروف رہے، اور اس پر خدا کا شکر بجا لائے، واللہ اعلم بالصواب۔

الحمد للہ الذی بنعمۃ تتم الصالحات